نوادراتِ شبلی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

نوادراتِ شبلی

ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن
تو شبلی سا وحید عصر و یکتائے زمن دیکھیں

(حالی)

نوادرات شبلی

علامہ شبلی کی ان نو دریافت تحریروں کا مجموعہ جو ان کی
تحریروں کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ادبی دائرہ، اعظم گڑھ

. کتاب	:	نوادرات شبلی
. مرتب	:	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
. ناشر	:	مرتب
. مطبع	:	اصیلہ پریس، نئی دہلی
. صفحات	:	۲۵۶
. طبع اول	:	اکتوبر ۲۰۱۷ء
. رابطہ	:	09838573645
. ای میل	:	azmi408@gmail.com
. قیمت	:	۴۰۰/روپے

ملنے کے پتے

۱۔ ادبی دائرہ، اعظم گڑھ۔ ۲۷۶۰۰۱

۲۔ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ ۲۷۶۰۰۱

علم دوست

ڈاکٹر عطا خورشید

کے نام

ترتیب

باب سوم: دیباچہ و تقریظ

باب چہارم: مکتوبات

باب پنجم: مراسلات

باب ششم: منظومات

باب ہفتم: متفرقات

دیباچہ

علامہ شبلی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کے اسلوب بیان کا یہ معجزہ اوران کے خلوص کی برکت ہے کہ ان کی تحریروں نے بے حد مقبولیت پائی۔ تصنیفات بالخصوص الفاروق اور سیرۃ النبیؐ جیسی عالمی شہرت یافتہ کتابوں کا کیا ذکران کے مضامین و مقالات اور شاعری کے مجموعوں نے بھی شہرت دوام حاصل کی۔ ان کی زندگی ہی میں ناشرین نے متعدد بار ان کے مجموعہ ہائے مضامین و مقالات شائع کئے۔ تاریخی مقالات کا ایک اہم مجموعہ ''رسائل شبلی'' خود علامہ شبلی نے ۱۸۹۸ء میں شائع کیا، لیکن طبع واشاعت کے یہ سلسلے منصوبہ بند نہ تھے، بلکہ وقتی ضرورت کے تحت ناشروں نے مالی فوائد کے پیش نظر انجام دئے۔ البتہ علامہ شبلی کی وفات [۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء] کے بعد جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے ان کے مضامین و مقالات اور خطوط وخطبات کو نہایت سلیقہ کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا۔ اولاً دو جلدوں میں ''مکاتیب شبلی'' اور آٹھ جلدوں میں ''مقالات شبلی'' شائع کئے۔ خطبات کا ایک مجموعہ ''خطبات شبلی'' صاحب شعرالہند مولانا عبدالسلام ندوی [۱۸۸۳- ۱۹۵۶ء] نے مرتب کیا۔ مکتبہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ سے مولانا سید سلیمان ندوی نے اولاً علامہ شبلی کے فارسی شاعری کے مجموعے دستہ گل، بوئے گل اور برگ گل شائع کئے، پھر فارسی کلیات شائع کیا۔ شعرالعجم جلد پنجم کی ترتیب و تدوین واشاعت کا کام بھی انہیں نے انجام دیا۔

اردو کلام کی ترتیب وتدوین بلکہ کلیات کی اشاعت کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے۔ بعد ازاں تشنۂ تکمیل سیرۃ النبیؐ کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے انھوں نے سلسلہ سیرت النبیؐ کا آغاز کیا جو خود ان کے لئے وجہ افتخار بن گیا۔ غرض علامہ شبلی کی تحریروں کی ترتیب وتدوین کا سلسلہ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۴۰ء تک مسلسل جاری رہا۔ اس عرصہ میں خطوط وخطبات، مقالات اور ان کے کلام کی ۱۳؍جلدوں میں تدوین ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے علامہ شبلی کی سوانح زندگی ''حیات شبلی'' (مطبوعہ: ۱۹۴۳ء) لکھی۔ شبلی شناسی کے میدان میں مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی وفات [۱۹۵۳ء] کے ایک عشرہ بعد ۱۹۶۴ء میں مشتاق حسین اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ نے ''باقیات شبلی'' شائع کی۔ اس میں علامہ شبلی کے وہ خطوط وخطبات، مقالات اور رودادیں شامل ہیں جو مولانا سید سلیمان ندوی کے مرتب کردہ مجموعہ ہائے مقالات وخطبات اور مکاتیب کی گیارہ جلدوں میں شامل نہیں ہیں۔ شبلی شناسی بلکہ تفہیم شبلی کے لئے باقیات شبلی کی بھی اہمیت کچھ کم نہیں۔

مکاتیب شبلی کی اشاعت کے تقریباً سو سال بعد ۲۰۱۲ء میں راقم نے علامہ شبلی کے نو دریافت خطوط کا مجموعہ ''مکتوبات شبلی''، تفصیلی تعلیقات وحواشی کے ساتھ ادبی دائرہ اعظم گڑھ سے شائع کیا۔ یہ مکاتیب شبلی کا چوتھا مجموعہ ہے۔ اس کے بعد ماہنامہ الندوہ لکھنؤ کے شذرات شبلی کو جو سو برس سے کسی شبلی شناس کی توجہ کے منتظر تھے، راقم نے اپنی بے بضاعتی کے باوجود مرتب کیا اور دار المصنّفین نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ ازاں بعد علامہ شبلی کے نو دریافت مراسلات کو راقم نے ضروری تعلیقات و حواشی کے ساتھ مرتب کیا۔ اسے بھی ''مراسلات شبلی'' کے نام سے دار المصنّفین نے

۲۰۱۶ء میں شائع کیا۔ بلاشبہ یہ تینوں کتابیں نہ صرف شبلی شناسی کے میدان میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ افکار شبلی کی تفہیم کے لئے ان کا مطالعہ لازمی ہے۔

۲۰۱۴ء شبلی صدی کا سال تھا۔ اس موقع پر علامہ شبلی نعمانی اور ان کے افکار و نظریات پر تصنیفات و تالیفات اور اہل قلم کے تحقیقی و تنقیدی کتب و مقالات شائع ہوئے۔ خاص طور پر دارالمصنّفین نے اس سلسلے کی متعدد اہم کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ ملک و بیرون ملک متعدد سمینار، سمپوزیم اور رسائل کے خصوصی شبلی نمبر شائع ہوئے اور بلاشبہ شبلی شناسی کے میدان میں اس قدر اضافہ ہوا کہ اس سے قبل حتیٰ کہ ۱۹۶۴ء میں دارالمصنّفین کے پچاس سالہ جشن کے موقع پر بھی نہیں ہوا تھا۔ اس ناچیز نے بھی ایک مبسوط کتاب ''شبلی شناسی کے سو سال'' لکھ کر علامہ شبلی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ راقم کو اس جدید ذخیرہ شبلیات کے مطالعہ کے دوران بار بار احساس ہوا کہ باقیات شبلی کی اشاعت ۱۹۶۴ء کے بعد علامہ شبلی کی جو تحریریں (مکتوبات، شذرات، مراسلات، نوادرات) دریافت ہوئیں وہ شبلی صدی کے مقالہ نگاروں کے پیش نظر نہیں رہیں۔ ان کا اگر مطالعہ کیا گیا ہوتا تو شبلی کی سوانح اور ان کی فکر و نظر کے بعض پہلو روشن سے روشن تر ہو جاتے اور بعض انتہائی اہم اور نئے پہلو سامنے آتے اور علامہ شبلی کے حوالہ سے بعض ہرزہ سرائیوں کا سد باب بھی ہو جاتا۔ اس خیال نے ان نوادرات شبلی کی ترتیب و تدوین کا دل میں داعیہ پیدا کیا۔ چنانچہ اس ہیچمدان نے خرابی صحت کے باوجود علامہ شبلی کی نادر تحریروں کی جمع و تدوین کے محنت اور دقت طلب کام کا آغاز کیا اور تلاش و جستجو کے بعد شبلی کے قلم کے جو موتی ہاتھ آسکے وہ قدر دانان شبلی کے حضور حاضر ہیں۔

نوادرات شبلی میں علامہ شبلی کی وہ تحریریں، تقریریں، دیباچے، منظومات، مکتوبات اور مراسلات شامل ہیں جو دارالمصنّفین سے شائع ہونے والے کسی مجموعہ

میں شامل نہیں ہیں اور جو باقیات شبلی میں بھی شامل نہیں ہیں۔اس طرح گویا یہ کتاب علامہ شبلی کی تحریروں کا پندرہواں اور نیا مجموعہ ہے۔ مجھے خوشی بلکہ فخر ہے کہ سو سال بعد اس کی ترتیب وتدوین کا کام میرے حصہ میں آیا:

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے:

۱۔ باب اول: مضامین

مولانا سید سلیمان ندوی نے درج ذیل مجموعہ مقالات شائع کئے:

۱۔	مقالات شبلی جلد اول، مذہبی	تعداد مقالات: ۱۶
۲۔	مقالات شبلی جلد دوم، ادبی	تعداد مقالات: ۱۰
۳۔	مقالات شبلی جلد سوم، تعلیمی	تعداد مقالات: ۱۱
۴۔	مقالات شبلی جلد چہارم، تنقیدی	تعداد مقالات: ۱۷
۵۔	مقالات شبلی جلد پنجم، سوانحی	تعداد مقالات: ۸
۶۔	مقالات شبلی جلد ششم، تاریخی	تعداد مقالات: ۷
۷۔	مقالات شبلی جلد ہفتم، فلسفیانہ	تعداد مقالات: ۱۲
۸۔	مقالات شبلی جلد ہشتم، قومی واخباری	تعداد مقالات: ۴۶

میزان: ۱۲۷

''باقیات شبلی'' میں کل چھ مضامین شامل ہیں، ان کی شمولیت سے مضامین و مقالات شبلی کی تعداد ۱۳۳؍ ہو جاتی ہے۔اس کے بعد چار اور مضامین دریافت ہوئے جو اس نئے مجموعہ نوادرات شبلی کا حصہ ہیں، اس سے مقالات شبلی کی مجموعی تعداد اب ۱۳۷؍ ہو گئی ہے۔

نو دریافت مضامین اس لحاظ سے بے حد اہم ہیں کہ ان سے اب تک علامہ شبلی کی فکر ونظر پر بحث وتنقید میں تعارض نہیں کیا گیا ہے۔اس میں تعلیم کے موضوع پر ایک انگریزی تحریر شامل ہے جو یقینی طور پر ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ کس کے قلم سے ہے اس کا اب تک علم نہیں ہو سکا۔خود یہ بات کہ علامہ شبلی نے ۱۹۱۱ء کی شملہ کی اورینٹلسٹ کانفرنس میں شرکت کی تھی اور تعلیم کے موضوع پر اظہار خیال کیا تھا، یہ انکشاف بھی حیات شبلی میں ایک اضافہ ہے۔

۲۔ باب دوم: خطبات

علامہ شبلی نعمانی ایک بڑے خطیب تھے اور اپنے انداز خطابت سے مجمع پر چھا جاتے تھے اور ایسی مدلل گفتگو کرتے کہ اہل علم حیرت زدہ رہ جاتے۔مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کے کمال خطابت کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

> ''یہ قدرت آج صرف انہیں (شبلی) کو حاصل ہے کہ جس موضوع پر چاہتے ہیں ایک مرتب اور مدون تصنیف حاضرین کو سنا دیتے ہیں۔ان کا لکچر بلحاظ ترتیب مطالب اور حسن استدلال ایک مکمل رسالہ ہوتا ہے جس کو اگر قلم بند کیا جائے تو نظر ثانی کی بھی ضرورت نہ ہو اور بلا تامل رسائل شبلی میں ایک اضافہ ہو جائے۔''
>
> (الندوہ،اپریل ۱۹۱۰ء۔ص ۱۱)

علامہ شبلی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور تحریک ندوہ کے اجلاسوں میں خاص طور پر شریک ہوتے، بحث میں حصہ لیتے،قراردادیں پیش کرتے اور زیر بحث موضوعات پر خطاب کرتے اور تجاویز پیش کرتے۔ ان کے اس طرح کے متعدد خطبات ریکارڈ کئے گئے اور متعلقہ رسائل اور رودادوں میں شائع ہوئے۔ان کا ایک مجموعہ مولانا عبدالسلام ندوی نے ''خطبات شبلی'' کے نام سے ۱۹۴۱ء میں مرتب کیا تھا،

جس کے ہندو پاک سے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

خطبات شبلی میں ۱۶؍خطبات شامل ہیں، سولہواں خطبہ مولانا عبدالسلام ندوی کا شامل کردہ نہیں ہے۔ انہوں نے ۱۵؍خطبات کا مجموعہ شائع کیا تھا۔ ستمبر ۱۹۸۶ء میں مجلّہ فکر ونظر اسلام آباد میں علامہ شبلی کا ایک خطبہ بعنوان ''حقوق نسواں'' شائع ہوا، اسے بعد میں ''خطبات شبلی'' میں شامل کر دیا گیا ہے، غالباً دارالمصنّفین کے تیسرے ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اسے شامل کیا کہ یہ انہیں کا دور نظامت تھا۔ اس اعتنا کے باوجود اس مجموعہ سے بے اعتنائی کا یہ قصہ ہے کہ عرصہ تک مولانا سید سلیمان ندوی کے نام سے شائع ہوتا رہا۔ اور ایک بڑی یونیورسٹی کی استاذ نے اس کے دیباچہ سے کچھ اقتباسات نقل کئے تو اسے بھی مولانا سید سلیمان ندوی کے نام سے نقل کیا۔ اب نئے ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر دی گئی ہے۔

زیر نظر کتاب میں شامل سات خطبات ''خطبات شبلی'' کے علاوہ ہیں اور نئی دریافت ہیں اور بلاشبہ بڑے اہم اور وقیع ہیں۔ اور بعض خطبات مثلاً ''ختم نبوت'' وغیرہ ذخیرہ شبلیات میں پہلی بار سامنے آئے ہیں۔ اس میں بعض خطبات طویل ہیں اور بعض مختصر، بعض ان ہی کے قلم سے ہیں اور بعض مختصر نویسوں نے تیار کئے ہیں۔ ایک خطبہ میں محض روداد ہے لیکن اس قدر یقینی ہے کہ یہ سب علامہ شبلی ہی کے زبان و قلم کے موتی ہیں۔

نوادرات شبلی میں اتفاق سے ان کی اب تک کی سب سے قدیم دریافت تقریر بھی شامل ہے جو انہوں نے سید محمود کے ہائی کورٹ الہ آباد کا جج بننے کے موقع پر اعظم گڑھ کے ایک جلسہ میں کی تھی اور جسے خود سرسید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (۱۵؍اگست ۱۸۸۲ء) میں شائع کیا تھا۔ یہ تقریر اس وقت کی ہے جب علامہ شبلی علی گڑھ کالج سے وابستہ ہوئے تھے اور نہ سرسید کی انہیں سرپرستی حاصل ہوئی تھی، تاہم

اس میں بڑی پختگی ہے۔ اور اس سے ملک وملت کے تئیں ہمدردی اور اس کے مسائل سے ان کی پوری واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس دور شباب میں بھی وہ ملت کے مسائل سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اس کے لئے فکر مند بھی تھے اور اس کی ترقی کے جذبات بھی ان کے دل میں موجزن تھے۔

زیر نظر کتاب میں شامل بعض خطبات شبلی بے حد اہم ہیں۔ خاص طور پر فارسی زبان کی حمایت میں انہوں نے جو تقریر کی ہے وہ بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں انہوں نے فارسی کی بحیثیت زبان اور اس کی لسانی، تہذیبی اور تمدنی خوبیاں جس طرح بیان کی ہیں شاید کسی اہل زبان نے بھی اس خوبی سے بیان نہ کی ہوں گی۔

۳۔ باب سوم: دیباچہ و تقریظ

علامہ شبلی نے متعدد اہل قلم کی کتابوں پر دیباچے اور تقریظات لکھیں، جسے گردش لیل ونہار نے نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ چنانچہ تلاش وتفحص کے بعد اب تک ۱۶/ دیباچے اور تقریظات دستیاب ہوئی ہیں۔ یہ تقریظات مختلف النوع موضوعات پر مشتمل کتابوں پر ہیں۔ ان میں بعض مختصر اور بعض مختصر ترین کہی جا سکتی ہیں، تاہم سب میں یہ قدر مشترک ہے کہ چند جملوں میں کتابوں کا جوہر پیش کر دیا گیا ہے۔

یہ دیباچے پہلی بار یکجا قارئین کے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں۔ اس میں ایک فارسی دیباچہ جو انہوں نے سرسید احمد خاں کے سفرنامہ پنجاب پر سرسید کی زندگی میں لکھا تھا شامل ہے۔ اسی طرح ایک منظوم دیباچہ بھی شامل ہے جو عبدالرحمٰن حیرت جھنجھانوی کی مثنوی شمامہ مشام افروز (مطبع تہذیب آفاق، مرادآباد۔۱۳۰۳ھ) پر انہوں نے منظوم کیا تھا۔ ان دیباچوں سے جہاں شبلی اور عہد شبلی کی دیباچہ نگاری کے اوصاف سامنے آتے ہیں وہیں ان کے بعض افکار کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔

٤۔ باب چہارم: مکتوبات

علامہ شبلی کے مکتوبات کے اب تک چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں:

۱۔ مکاتیب شبلی اول۔مولانا سید سلیمان ندوی۔دارالمصنّفین ۲۰۱۰ء ۴۰۰خطوط

۲۔ مکاتیب شبلی دوم۔مولانا سید سلیمان ندوی۔دارالمصنّفین ۲۰۱۲ء ۳۷۹خطوط

۳۔ خطوط شبلی، مولوی امین زبیری، مقدمہ ڈاکٹر شمس بدایونی، دہلی ۲۰۱۷ء ۱۰۳خطوط

۴۔ مکتوبات شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔اعظم گڑھ۔۲۰۱۲ء ۲۰۹خطوط

میزان ۱۰۹۱خطوط

اس طرح علامہ شبلی کے ۱۰۹۱ مکاتیب مدون ہو کر کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔خطوط کا ایک اور مجموعہ خطوط شبلی بنام آزاد جناب محمد حسنین نے مرتب کیا تھا اور جو پٹنہ سے شائع ہوا تھا چونکہ اس میں شامل تمام خطوط مکاتیب شبلی اور مکتوبات شبلی میں آ گئے ہیں اس لئے اس کا مستقل طور پر ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

ان مجموعہ ہائے مکاتیب کی اشاعت کے بعد سے اب تک ۲۴/نئے خطوط دریافت ہوئے ہیں جنہیں اس باب میں شامل کیا گیا ہے۔ان پر توضیحی نوٹ بھی لکھے گئے ہیں اور مکتوب الیہ کا بھی کسی قدر ذکر کیا گیا ہے۔اس میں متعدد مکتوب الیہ مکاتیب شبلی، خطوط شبلی اور مکتوبات شبلی کے مکتوب الیہ سے مختلف اور نئے ہیں، جو سوانح شبلی کے باب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ منشی نجم الدین [۱۸۷۰-۱۹۶۰ء] علی گڑھ

۲۔ میر صدر الدین حسین خاں رئیس بڑودہ

۳۔ آنریری سکریٹری ایجوکیشنل کانفرنس

۴۔ مولانا اشرف علی ایم اے [۱۸۳۳-۱۹۰۸ء]

۵۔ ایڈیٹر وکیل امرت سر

۶۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد [۱۸۷۸-۱۹۴۷ء]

۷۔ میر اصغر علی، حیدر آباد

۸۔ مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور [۱۸۶۸-۱۹۳۳ء]

۹۔ سید عبدالسلام

۱۰۔ خواجہ کمال الدین

مذکورہ نو دریافت خطوط علامہ شبلی کے فکر و خیال کے لحاظ سے بھی بے حد اہم ہیں۔ مطالعات شبلی میں انہیں کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

۵۔ باب پنجم: مراسلات

علامہ شبلی اپنے عہد کے ایک بڑے مراسلہ نگار تھے۔ یہ ان کی کتاب زندگی کا ایک بڑا وصف ہے جس کا ذکر علی العموم نہیں کیا گیا ہے۔ علامہ شبلی نے اپنے عہد کے ہندوستان کے ممتاز اخبارات ہمدرد دہلی، زمیندار لاہور، الہلال کلکتہ، وکیل امرت سر اور پیسہ لاہور وغیرہ میں تو مراسلے لکھے ہی ہیں عالم عربی کے مجلّات الہلال مصر، المنار مصر اور بیروت وغیرہ میں بھی وہ مراسلات لکھا کرتے تھے۔ تلاش و تفحص کے بعد اس طرح کے ۲۶؍ مراسلات کو راقم نے ''مراسلات شبلی'' میں جمع کر دیا ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد دو اور بڑے اہم مراسلات قدیم اخبارات میں مل گئے، جنہیں زیر نظر کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ ایک مراسلہ میں ندوہ کے تکلیف دہ حالات اور مخالفین شبلی کے بعض الزامات کا ذکر ہے، جب کہ دوسرے میں مدینہ یونیورسٹی کے نصاب و نظام پر بحث کی گئی ہے۔ واضح رہے کہ مکہ یونیورسٹی کی تجویز شبلی اور مدینہ یونیورسٹی کے نصاب تعلیم کی ترتیب کا معاملہ حیات شبلی کا نو دریافت باب ہے اور اس کے دریافت کا سہرا دارالمصنّفین کے ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کے سر ہے جنہیں علامہ شبلی سے غایت درجہ عقیدت ہے۔

باب ششم: منظومات

علامہ شبلی فارسی کے ایسے زبردست شاعر تھے کہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ مرزا غالب پر نہیں علامہ شبلی پر ہوا۔ انہوں نے فارسی میں بکثرت شاعری کی، خاص طور پر علی گڑھ کے زمانہ قیام میں کالج میں مہمانوں کی آمد پر بارہا قصیدے کہے اور بڑے اہتمام سے پیش کئے۔ اس طرح کے متعدد قصیدے کلیات شبلی فارسی میں شامل نہیں بلکہ کلیات کی تدوین کے بعد دریافت ہوئے جنہیں اس باب میں جمع کر دیا گیا ہے۔ ان قصائد اور منظومات میں شبلی کا رنگ پھیکا نہیں ہے بلکہ ان میں بھی وہی تب و تاب ہے جو شبلی کی فارسی شاعری کا جوہر ہے۔

اس باب میں علامہ شبلی کے صرف قصیدے ہی نہیں بلکہ متعدد متفرق نو دریافت منظومات بھی شامل ہیں۔ اس میں ایک کتاب پر منظوم تقریظ بھی ہے۔ متفرق اشعار بھی ہیں۔ فارسی کی متعدد غزلیں بھی شامل ہیں اور آخر میں علامہ شبلی کا اردو کلام یکجا کیا گیا ہے۔ اس میں نو دریافت غزلوں کے ساتھ تمام اردو غزلیں ظفر الملک علوی ایڈیٹر الناظر کے مرتب کردہ مجموعہ ''کلام شبلی'' (مطبوعہ: ۱۹۱۸ء) سے شامل کی گئی ہیں، کیونکہ یہ کلیات شبلی میں شامل نہیں ہیں۔ کئی لحاظ سے یہ باب بہت اہم ہے اس میں شبلی کے بلند شاعرانہ فکر و شعور کے جلوے نگاہوں کو خیرہ کرتے ہیں۔

۷۔ باب ہفتم: متفرقات

اس باب میں علامہ شبلی کے قلم سے نکلی ہوئی علم و ادب اور تاریخ و تنقید کے مختلف موضوعات پر متفرق اور منتشر تحریروں کو جمع کیا گیا ہے جو اس سے پہلے کسی مجموعہ میں شامل نہیں۔ اس میں بہت سی تحریریں بے عنوان تھیں، راقم نے ان کے عناوین

طے کر دئے ہیں۔معلومات اور خیالات شبلی کے لحاظ سے یہ باب بھی کم اہمیت کا حامل نہیں۔مکمل شبلی اور ان کی معنویت کی بازیافت کے لئے اس باب کا مطالعہ قدر دانان شبلی کے لئے بے حد ضروری ہے۔

ہر باب کی تقریباً تمام نو دریافت تحریروں پر تشریحی اور توضیحی نوٹ لکھے گئے ہیں جس سے اس کے مالہ و ماعلیہ کا پورے طور پر اندازہ ہوجاتا ہے۔یہ تحریریں کہاں دستیاب ہوئیں، ان کا حوالہ بھی دیدیا گیا ہے۔ان کے استناد پر بھی بحث کی گئی ہے، کہیں کہیں افادیت کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور کہیں صرف حوالوں پر ہی اکتفا کر لیا گیا ہے۔امتیاز کے لئے یہ تمام تفصیلات حوض میں درج کی گئی ہیں۔

''نوادرات شبلی'' میرے سلسلہ مطالعات شبلی کی بارہویں کڑی ہے۔اس سے قبل شبلی شناسی کے موضوع پر میری گیارہ کتابیں شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہیں۔ان میں متعلقات شبلی، کتابیات شبلی، آثار شبلی، مکتوبات شبلی، شبلی شناسی کے سو سال، شبلی سخنوروں کی نظر میں اور شبلی اور جہان شبلی کو خاص طور پر بے حد مقبولیت نصیب ہوئی۔ان تصنیفات وتالیفات کا بنیادی مقصد شبلی کے نظریہ علم وادب کو عام کرنا ہے۔امید ہے یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

مشہور اہل قلم اور سلسلہ کوثریات کے مصنف شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ تحریک علی گڑھ میں پیر میکدہ یعنی سر سید کے بعد سب سے زیادہ جامع کمال شخصیت شبلی ہی کی تھی۔اکتوبر ۲۰۱۷ء میں سر سید احمد خاں کی ولادت کو ۲۰۰ر سال مکمل ہو رہے ہیں۔اس موقع کی مناسبت سے ملک میں سر سید کو خراج عقیدت پیش کرنے کا ایک سلسلہ قائم ہو چکا ہے۔ان کی فکر ونظر اور کارناموں پر کتابیں لکھی جارہی ہیں۔سیمینار ہو رہے ہیں۔رسائل کے خصوصی شمارے شائع کئے جارہے ہیں اور ہر شخص اپنے اس محسن قوم وملت کو یاد کر رہا ہے۔راقم کا خیال ہے کہ اس موقع پر سر سید کے ساتھ ان کے

نامور رفقا اوران کے کارناموں کو یاد کرنا بھی دراصل سرسید کو ایک قسم کا خراج پیش کرنا ہے۔ راقم اپنی اس ناچیز تالیف کو پرستاران سرسید کی خدمت میں بطور خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سید مرحوم کی قبر کو نور سے بھر دے۔

اظہار تشکر

سنہ ۲۰۱۶ء پریشانیوں کی نذر رہا۔ والدہ کی علالت اور وفات (۳؍جنوری ۲۰۱۶ء) کے بعد عارضہ قلب نے سنگین صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ بائی پاس سرجری ہوئی اور ڈاکٹروں کی مایوسی کے باوجود اللہ تعالیٰ کی رحمت بے پایاں سے زندگی نصیب ہوئی۔ سچ ہے میں رب کریم کا جس قدر شکر بجالاؤں کم ہے۔

میں اپنے تمام احباب، بزرگ اور محسنین اور اپنے خانوادے کے ہر فرد کا شکر گذار ہوں جنہوں نے میری زندگی اور صحت کے لئے مصلے بچھا لئے۔ میں اپنے فیس بک دوستوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے دنیا بھر میں میرے لئے دعائیں کیں۔

میں شکر گذار ہوں محبّ مکرم جناب ڈاکٹر شباب الدین صاحب صدر شعبہ اردو شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ کا جنہوں نے محض دل جوئی اور ہمت افزائی کے لئے شعبہ اردو کے ایوارڈ ''امتیاز شبلی'' سے سرفراز کیا۔ اور اس کے لئے ایک باوقار تقریب منعقد کی۔

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے بانی چیرمین، برادر عزیز ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی اور ٹرسٹ کے دیگر ذمہ داران کا شکر گذار ہوں کہ ان لوگوں نے علامہ شبلی سے متعلق میری علمی وادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے ٹرسٹ کا انتہائی باوقار اعزاز ''افتخار شبلی'' تفویض کیا۔ یہ اعزاز اردو کے ایک بڑے خدمت گذار مولوی عبدالحق، اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر مظفر علی شہ میری کے ہاتھوں عطا

کیا گیا۔

ان اعزازات سے یقینی طور پر میرے اندر عزم وحوصلہ، توانائی اور طمانیت کا احساس پیدا ہوا اور میں بیماری کے بعد ٹوٹتی ہوئی ہمت کے حصار سے باہر نکل آیا۔ اس قدر محبت کرنے والوں کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ انہیں نعم البدل عطا فرمائے۔

دارالمصنّفین کے سابق رفیق، ماہنامہ الرشاد کے مدیر اور ممتاز اہل قلم گرامی قدر ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی مدظلہ کا بھی بے حد ممنون ہوں کہ ہر مرحلہ میں ان کی دعائیں شامل حال رہیں اور انہوں نے ماہنامہ الرشاد میں نقطۂ نظر کے عنوان سے میری کتابوں پر حوصلہ افزا تبصرہ لکھ کر میری محنتوں کی داد دی۔ اس سے اپنی تصنیفات اور تصنیفی زندگی دونوں سے محبت میں اضافہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ شفقت تادیر قائم رکھے۔

اس کتاب کی تالیف میں متعدد احباب نے میرا بڑا تعاون کیا۔ خاص طور پر حبیب مکرم ڈاکٹر عطا خورشید صاحب اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ اور ڈاکٹر محمد مسعود حسن صاحب اسسٹنٹ لائبریرین خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے تعاون کا میں بے حد شکر گذار ہوں اور ان کے لئے بہترین جزا کی دعا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں رام پور اور برادرم سلیم جاوید اعظمی ناظر کتب خانہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ نے بھی حق تعلق نبھایا۔ میں ان لوگوں کا بھی شکر گذار ہوں۔ گرامی قدر ڈاکٹر مشتاق اعظمی صاحب کا شکریہ نہ ادا کرنا احسان ناشناسی ہوگی کہ ان کے نیک اور مفید مشوروں سے بڑا حوصلہ اور یقین محکم کی دولت میسر ہوئی۔

استاذ گرامی جناب ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی صاحب سابق صدر شعبہ عربی شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ کے احسانات سے میں کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ اس کتاب کو انہوں نے از سر نو دیکھا، اغلاط کی تصحیح کی اور انتہائی مفید مشوروں سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ

ان کا سایہ شفقت دراز فرمائے۔

اس کتاب کی سلیقہ سے کمپوزنگ ایک مشکل کام تھا اور خاص طور پر اس صورت میں کہ درمیان میں بار بار اضافے ہوتے رہے۔ یہ کام حسن اور سلیقہ مندی سے میری بیٹی عفت جہاں جو B.Sc.III کی طالبہ ہے، نے انجام دیا ہے میں اس کے روشن مستقبل کے لئے دعا گو ہوں۔

ناچیز
محمد الیاس الاعظمی
اعظم گڑھ
یکم ستمبر ۲۰۱۷ء

باب اول

مضامین

[ا]

غضاری رازی

یہ مضمون علامہ شبلی کی زندگی میں ماہنامہ غنچہ جاوید بمبئی میں شائع ہوا تھا پھر اسے قاضی افضل حق قرشی نے ادبی دنیا لاہور میں شائع کیا۔ قاضی افضل حق قرشی لکھتے ہیں:

''۱۹۰۶ء میں بمبئی سے ایک ادبی، علمی ماہنامہ غنچۂ جاوید سید کاظم حسین ہدف لکھنوی کی زیر ادارت نکلا کرتا تھا۔ اس میں ایک حصہ مضامین نثر اور ایک حصہ طرحی کلام کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ اس کے قلمکاروں میں شبلی نعمانی، خواجہ حسن نظامی، سید علی حیدر طباطبائی لکھنوی، عبدالرحمٰن رسا، رضی بلگرامی، آگاہ دہلوی، تلمیذ غالب سایل دہلوی، حسن بریلوی، احسن مارہروی، عزیز لکھنوی، ظہیر دہلوی، اکبرالہ آبادی، جلیل اور ثاقب بدایونی جیسے قادرالکلام شاعر اور مشہور انشاپرداز شامل تھے۔ آج اس رسالہ میں سے مولانا شبلی کا ایک مضمون ''غضاری رازی'' تبرکاً پیش کیا جاتا ہے، جو غنچۂ جاوید کی جلد دو نمبر ۵ بابت ماہ نومبر ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون **شعر العجم**، مقالات شبلی اور باقیات شبلی میں شامل نہیں۔ غضاری رازی کون تھا؟ مولانا **شعر العجم** میں تحریر فرماتے ہیں:

''محمودی شعراء اگرچہ بے شمار ہیں لیکن جن ناموروں کو محمود نے ندما میں داخل کرلیا تھا اور جو آسمان سخن کے سبعہ سیارے تھے، یہ ہیں: عنصری، فردوسی، اسدی، عسجدی، غضاری، فرخی، منوچہری۔''(۱)

ایک اور جگہ عنصری کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

''محمود کے دربار میں چار سو شعراء تھے جن میں فرخی، عسجدی، غضاری، منوچہری جیسے قادرالکلام بھی شامل ہیں۔''(۲)

مولانا اس شاعر کا تخلص عام طور پر غضاریؔ لکھتے ہیں مگر مندرجہ ذیل شواہد کی بنا پہ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس کا تخلص غضایریؔ ہے نہ کہ غضاریؔ۔ لباب الالباب (جو کہ فارسی کا قدیم اور منظّم تذکرہ ہے)(۳) میں لکھا ہے کہ:

''غضایری امیر شعراء عراق وقدوۃ الفضلا آفاق بودہ است۔ رواق رفعت کلام وی برتر از طاق سپہر و خاطر روشن او مصیقلۂ آئینہ مہر۔''(۴)

اس سے بھی قدیم سند کی ضرورت ہو تو غضایری کا یہ اپنا شعر جو اس نے قصیدۂ لامیہ میں لکھا ہے:

کجا شریف بود چوں غضایری بر تو
زطبع باشد چونانکہ زرّ سرخ سفال(۵)

عنصریؔ کے قصیدہ کا یہ شعر جو اس نے قصیدۂ لامیہ کے جواب میں لکھا:

ایا غضایری ای شاعری کہ در دل تو
بجز تو ہر کہ بود ناقص آید و لنگال(٦)

خزانۂ عامرہ میں یوں مرقوم ہے۔

غضایری بعضی بعین معجمہ ضبط کردہ اند و بعضی بعین مہملہ طائفہ اولیٰ گفتہ اند کہ پدرش کاسہ گر بود غضائر جمع غضارہ است بالفتح کہ دراصل لغت عرب بمعنی گل چسپیدہ باشد و در کلام مولدین بمعنی کاسہ استعمال یافتہ چنانچہ شیخ جلال الدین سیوطی در مز ہر اللغتہ از لغاتی نقل میکند کہ الغضارۃ مولدۃ لانہا من حرف وصناع العرب من خشب۔'' (۷)

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا تاریخ ادبیات ایران میں رقم طراز ہیں:

''لقب شعری او غضایری۔ غضاری ہر دو نوشتہ اند۔ اودر اشعارش غضایری آوردہ است۔'' (۸)

یہ غلط فہمی مولانا کو اپنے ماخذ مجمع الفصحا سے ہوئی۔ مجمع الفصحا میں غضاری رازی کے ضمن میں مذکور ہے۔

''شمش ابوے یزید محمد فضلاء فصحای عراق، مداح بہاؤالدولہ دیلمی بودوسبب ایں تخلص ہمانا آنکہ پدرش کارخانۂ کاسہ گری داشتہ کہ وی بدیں لقب رایت شہرت افراشتہ چراکہ غضارہ کاسہ را گویند۔ وی در کسب فضائل کمالات کوشیدہ و بادۂ علوم از کاسۂ الفاظ نوشیدہ در ہنر مسلم آں عصر شد۔ تعداد کمالات بدوحصہ وقتی مداحی بحضرت سلطان محمود بر دیک ہزار دینار صلت یافت۔ ہمانا غزلی ہم دریافت حسن ایاز معروض داشت یک ہزار تومان دیگر ہم منعم شد۔ تدریجاً بصلۂ مدائح مستغنی گردید۔ درحضرت سلطان ازنزدیکاں شد و برہمہ شعرائے دربار دربار محمودی محسودی یافت بپایہ ای رسید کہ ضرب المثل شعراشد۔ چنانکہ ابوالنجم احمد منوچہری گفتہ است درمدح سلطان مسعود بن محمود کہ،

برمن ز مدحت ارجو کان فرو جاہ باشد
چوں فرشاہ ماضی بود است باغضاری

منوچہری کے مندرجہ بالاشعر کے متعلق ڈاکٹر محمد معین تعلیقات چہار مقالہ میں اس طرح تشریح فرماتے ہیں

اما ایں بیت منوچہری کہ گویدے

برمن ز مدحت ارجو کان فرو جاہ باشد چوں فرشاہ ماضی بود است باغضاری

بلاشک محمول برضرورت شعر است (۱۰)

نیز تعلیقات چہار مقالہ کے حاشیہ پر ڈاکٹر محمد معین نے اس نوٹ کا اضافہ کیا ہے:

''درچنیں دو مصراع مقدم موخر چاپ شدہ۔ (م.م)''(۱۱)

مولانا شبلی کے نام سے کوئی اہل ہند ناواقف نہیں ہے اور اس لئے ہمیں یہ لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ ہمیں آپ کی عزت افزائی سے سچائی اور حقیقی کامیابی کی امید ہوگئی ہے۔ اب تک بفضل ایزدی غنچۂ جاوید بہت استقلال کے ساتھ ترقی کے زینے پر چڑھ رہا تھا اور خریداری کی حیثیت سے قوم نے اس کی خلاف امید قدر افزائی کی مگر حقیقی ترقی کے لئے پرچہ کو جس بات کی ضرورت ہے وہ قابل نامہ نگاروں کی قلمی امداد ہے۔ اس میں بھی گو ہماری سعی بارآور ہوتی رہی لیکن اب تک اس بارہ میں کامل اطمینان نہ ہوا تھا۔ خدا کا شکر کہ اب اعلیٰ سے اعلیٰ محسنین ملک نے بھی اس طرف نظر عنایت مبذول فرمائی ہے۔ اس ترقی کے زمانہ میں بہ تائید ایزیدی ہمیں مولانا شبلی صاحب کی

خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔ بمبئی میں آپ ایک ضرورت سے تشریف
لائے ہیں اور تصنیفی مشاغل نے آپ کو ایسا عدیم الفرصت بنا دیا ہے کہ
اگر تائید ایزدی شامل حال نہ ہوتی تو ہمارے ناچیز پرچہ کو بھی آپ کی
(کذا) کلام کے موتیوں سے دامن بھرنے کا فخر حاصل نہ ہوتا۔ آپ
نے بہت ہی خندہ جبینی سے اس عاجز کی درخواست کو منظور فرما کر ایک
مضمون عنایت فرمایا۔ ہم سچے دل سے مولانا کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔"

اکثر تذکروں میں غضایری لکھا ہے، لیکن یہ غلط ہے۔ منوچہری ایک قصیدہ میں لکھتا ہے:

برمن ز مدحت ارجو آں فرو جاہ باشد　　　کز فرشاہ ماضی بود است با غضاری

غضار عربی میں چپکنے والی مٹی کو کہتے ہیں۔ لیکن مولدین کی زبان میں پیالے کے معنوں میں مستعمل ہے۔ غضاری کا باپ کاسہ گر تھا اس غایت سے یہ تخلص اختیار کیا۔

بہاؤالدولہ بن عضد الدولہ دیلمی کے دربار میں تھا۔ سلطان محمود کی ہنر پروری کا شہرہ سن کر ایک قصیدہ اس کی مدح میں لکھا اور غزنین بھیجا۔ وہاں سے ہزار دینار انعام میں آئے۔ اب معمول ہوگیا کہ سال میں ایک قصیدہ لکھ کر بھیجتا اور ہزار دینار آتا۔ بہاؤالدولہ نے ۴۰۳ھ میں انتقال کیا۔ غضاری سے سلطان محمود نے دربار میں ایاز کی شان میں شعر کہنے کی فرمائش کی۔ غضاری نے ایک رباعی لکھ کر پیش کی، جس کے صلہ میں دو ہزار دینار مرحمت ہوئے۔ (۱۳) غضاری نے شکر گذاری میں ایک قصیدہ لکھا جس میں اس واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

مرا دوبیت بفرمود شہر یار عجم (۱۴)　　　بر آن صنوبر عنبر عذار و مشکیں خال

دو بدرہ زر بفرستادہ دو ہزار درہم　　بزعم حاسد و بیمار بد سگال نکال

....

ہزار بود و ہزار دگر ملک افزود　　زیک غزل کہ زمن خواست برلطیف غزال

....

دو بدرہ زر بگرفتم بہ فتح ناراین　　بہ فتح روسیہ صد بدرہ گیرم وخرطال (۱۵)

اس قصیدہ کے دوشعر بہت مشہور ہیں اور اگر مبالغہ واقعی کوئی عمدہ وصف ہے تو ان شعروں کا جواب نہیں۔

صواب کرد کہ پیدا نکرد ہر دو جہاں　　یگانہ ایزد وادار بے نظیر و ہمال
وگرنہ ہر دو جہاں راکف تو بخشیدی　　امید بندہ نماندی بہ ایزد متعال

....

یعنی ''خدا نے اچھا سلوک کیا کہ دونوں عالم یہاں نہیں پیدا کئے ورنہ تو دونوں، لوگوں کو بخش دیتا اور پھر بندوں کو کیا حاجت رہتی۔''

غضاری کا تقرب روز بروز بڑھتا گیا، یہاں تک کہ عنصری کو باوجود ملک الشعرائی کے رشک ہوا۔ غضاری کے قصیدہ کے جواب میں ایک بڑا لمبا قصیدہ لکھا اور غضاری پر اعتراضات کئے، لیکن تمام اعتراضات اس قسم کے ہیں جن کی شان میں مرزا صائب نے کہا ہے، ''شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد''۔ غضاری نے ایک بلیغ پیرایہ میں محمود کی انتہائی فیاضی کا مبالغہ کیا تھا۔

ہمہ کس از قبل نیستی فغاں دارند　　گہِ ضعیفی و بیچارگی و ستی مال
من آں کسم کہ فغانم بہ چرخ وزہرہ رسید　　زجود آں ملکی کو زماں داد ملال

....

بس ای ملک کہ نہ لؤلؤ فروختم بہ سَلَم　　بس ای ملک کہ نہ گوہر فروختم بجوال

بس ای ملک کہ ازیں شاعری وشعرمرا　　ملک فریب بخوانندو جادوی ختال!

....

بس ای ملک کہ دگر جای شعرشکر نماند　　مرا بہر دو جہاں درصحیفۂ اعمال(۱۶)

یعنی ’’اور لوگ تو مفلسی اور ناداری کا گلہ کرتے ہیں اور میں تیری بے انتہا فیاضی سے تنگ آ گیا ہوں۔ کچھ میں نے موتی تو نہیں بیچے ہیں کہ اس قدر قیمت کا مستحق ہوں۔ بس اب زیادہ فیاضی نہ کیجئے، ورنہ لوگ کہیں گے کہ میں نے فرشتے کو فریب دے دیا۔ اب شکر کے دفتر میں مطلق جگہ نہیں رہی۔ اس لئے فیاضی کیجئے گا تو شکر کیوں کر ادا کروں گا۔‘‘ عنصری کے اعتراضات یہ ہیں۔

بس ای ملک زعطائی تو خیرہ چوں گویند　　کہ بس نشان ملالت بود ز کبر و دلال

نہ بس بود کہ تو بر خلق رحمتی از ایزد　　بجائے رحمت ایزد خطا است لفظ لال

ملک فریب نہا دند خویشتن را ام　　بدان کہ شان زعطای تو خوب گشت احوال

غلط کنند کہ ہرگز ترا کسی نہ فریفت　　نہ رفت وہم نرود در توحیلت محتال

یعنی ’’عطائے شاہی کے مقابلہ میں ’’بس‘‘ کہنا گستاخی ہے۔ اپنے آپ کو ملک فریب کہنا کس قدر لغو ہے۔ بھلا حضور کو کوئی فریب دے سکتا ہے۔ اس قسم کے اور بہت سے اعتراضات ہیں۔ غضاری نے جواب الجواب لکھا اور ایک ایک اعتراض کا محققانہ جواب دیا۔ بڑا اعتراض یہ تھا کہ صلہ اور فیاضی سے کوئی شخص کیوں کر تنگ آ سکتا ہے۔‘‘

غضاری نے اس کو اس طرح ثابت کیا۔

اگر فغاں کنم از بار شکر او نہ شگفت　　فغان زلہو و زشادی بود نہ از اہوال

اگر بہ چشمۂ حیواں کسی غریق شود　　کہ با سلامت باقی ہمو دہدش وصال

یقین شناسم کز آب چشمۂ حیوان　　فغان کنند چواز سرگذشت آب زلال

لیکن یہ جواب منطقیانہ تھا اس لئے غضاری نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ثابت کیا کہ اور شعرا بھی یہ مضمون باندھتے آئے ہیں۔

بہ شعر نگہہ کن کہ رودکی گفتہ است　　　ہمہ کسے رادرویشی است ورنج وملال(۱۷)
غم وعنا است مرا گفت زین ضیاع وعقار　　　فغاں ہمی کنم از رنج گنج وضیعت مال
فغان بندہ ہمان و غم عناش ہمیں　　　نہ جائے طعنہ بماند نہ حیلت محتال

....

ایک اعتراض یہ تھا کہ سلطان محمود کو کیا کوئی شخص فریب دے سکتا ہے غضاری نے کہا، ہاں۔

بہ شعر نیک فریبد دل ملوک حکیم　　　چو حور خلد روان پیمبر و ابدال
فریب خصم بود عیب شہر یاراں را　　　نہ دل فریفتن نیکوان حسکیں خال
ہزار بیش شنیاری بت ملوک فریب　　　اگر جو دکند کس (۱۸) خرد بردست دیال

....

مجمع الفصحا میں یہ تینوں قصیدے بتامہا نقل کئے ہیں۔ ہم نے اختصار کے لحاظ سے قلم انداز کیا۔ غضاری کا قصیدہ جب عنصری کی نظر سے گذرا تو غضاری کو بلا کر اس کا دیوان پانی سے دھوڈالا۔ غضاری اپنے جگر گوشوں کو اپنی آنکھ کے سامنے فنا ہوتے ہوئے دیکھا کیا اور بیچارگی سے دم نہ مار سکا۔ یہی وجہ تھی کہ آج غضاری کا دیوان ہاتھ نہیں آتا۔ خیر دیوان فنا ہوا تو ہوا، عنصری کی مغلوبانہ بدنفسی کی داستان اب بھی باقی ہے۔ غضاری نے ۴۲۶ھ میں انتقال کیا۔

حواشی

(۱)　شبلی نعمانی، شعرالعجم، جلد اول ص ۵۷، اعظم گڑھ۔ ۱۹۴۰ء

(۲) ایضاً

(۳) ''زیادہ قدیم فارسی تصانیف جو شاعروں کے حالات زندگی سے کم وبیش منظّم طور پر بحث کرتی ہیں، صرف لباب الالباب عوفی اور چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی ہیں۔'' (تاریخ ادبیات ایران بعہد مغولان، از براؤن، ترجمہ داؤد رہبر، ص ۱۰۷، کراچی، ۱۹۴۹ء)

(۴) لباب الالباب، عوفی، جلد دوم، لندن، ۱۹۰۳ء، ص ۵۹، مرتبہ ای. جی. براؤن

(۵) مجمع الفصحا، ہدایت، جلد اول، ایران، ۱۲۹۵ھ، باہتمام آقا میر محمد باقر، ص ۳۶۹

(۶) دیوان عنصری، ایران طبع آقا محمد اردکانی، ۱۳۲۰ھ، ص ۸۶

(۷) خزانۂ عامرہ، آزاد بلگرامی، نول کشور کانپور، ۱۸۷۱ء، ص ۳۶۱

(۸) تاریخ ادبیات ایران، صفا، جلد دوم، ایران، ص ۵۷۰

(۹) مجمع الفصحا، ہدایت، جلد اول، ایران، ۱۲۹۵ھ، باہتمام آقا میر محمد باقر، ص ۳۶۸

(۱۰) تعلیقات چہار مقالہ، معین، تہران، ۵۷-۱۹۵۵ء، ص ۱۴۲

(۱۱) تعلیقات چہار مقالہ، معین، تہران، ۵۷-۱۹۵۵ء ص ۱۴۲، حاشیہ نمبر ۴

(۱۲) لباب الالباب، تعلیقات چہار مقالہ اور تاریخ ادبیات ایران میں ابوزید مرقوم ہے

(۱۳) خزانۂ عامرہ، مجمع الفصحا

(۱۴) مجمع الفصحا میں ''عجم'' کی جگہ ''جہاں'' لکھا ہے

(۱۵) یہ علیٰحدہ اشعار ہیں مگر مضمون میں ایک بند کی صورت میں تھے

(۱۶) یہ علیٰحدہ اشعار ہیں مگر مضمون میں ایک بند کی صورت میں تھے

(۱۷) مجمع الفصحا میں ''ملال'' کی جگہ ''عیال'' لکھا ہے۔

(۱۸) مجمع الفصحا میں ''کس'' کی جگہ ''پس'' لکھا ہے۔

(مشمولہ: ادبی دنیا لاہور، ستمبر ۱۹۶۶ء)

[۲]

کتب خانہ اسکندریہ

کتب خانہ اسکندریہ علامہ شبلی کا انتہائی اہم مقالہ ہے جو متعدد مجموعہ مقالات میں شائع ہو چکا ہے۔ زیرنظر مقالہ اس سے پہلے بطور تمہید شائع ہوا ہے اور کسی مجموعہ مقالات میں شامل نہیں۔

یورپ ایک زمانے میں مسلمانوں کی نسبت عجیب عجیب خیالات رکھتا تھا۔ اس زمانے میں سینکڑوں غلط روایتیں جو مسلمانوں کی نسبت مشہور تھیں یورپ کے لٹریچر کا عنصر بن گئیں۔ موجودہ یورپ اگرچہ بے تعصبی و انصاف پرستی سے کام لینا چاہتا ہے مگر جو زہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا اس کا اثر اب بھی موجود ہے اور شاید ایک مدت تک باقی رہے۔

''اسلام بزور شمشیر پھیلا'' بانی اسلام کو خود اپنی سچائی پر اعتقاد نہ تھا۔ ''اسلام تمام علمی تحقیقات کا دشمن ہے''۔ یہ اور اسی قسم کے بہت سے جملے یورپ کے اصول مرضوعہ ہیں۔ اخیر دعوے کے ثبوت میں عموماً کتب خانہ اسکندریہ کا واقعہ پیش کیا گیا ہے۔ یورپ کو خاص اس واقعہ سے اس قدر دلچسپی ہے کہ مسلمانوں کے تذکرہ میں موقع بے موقع اس کا ذکر ضرور آ جاتا ہے۔ حال میں فرانس کے ایک عالم نے شاہان فرانس کے حال میں ایک مختصر سی تاریخ لکھی ہے جس کا ترجمہ خدیو مصر کے اشارے سے عربی

زبان میں کیا گیا ہے۔اس تاریخ میں کہیں کہیں دوسرے ملکوں کے حالات بھی تطابق کے طور پر ذکر کئے ہیں۔حضرت عمرؓ کی وسیع اور موثر حکومت میں سے جو چیز اس کی نگاہ میں آئی وہ یہی کتب خانہ اسکندریہ کا واقعہ تھا۔فرانس کے حالات لکھتے لکھتے وہ لکھتا ہے کہ اسی ''سنہ میں مسلمانوں نے اسکندریہ پر حملہ کیا اور وہاں کا علمی کتب خانہ جلا کر برباد کر دیا۔'' بہرنوع ہم اس واقعہ کے ممنون ہیں،جس کے ذریعہ سے یورپ کی علمی دنیا کا بچہ بچہ حضرت عمر کے نام سے تو واقف ہے۔

ہماری قوم کے تعلیم یافتہ لوگ ان اعتراضات کا سننا گوارا نہیں کر سکتے اور نہایت جوش سے ان کے اٹھانے پر آمادہ ہیں۔اگرچہ افسوس ہے کہ انگریز مورخوں کے عامیانہ تقلید اور اسلامی تاریخ کے اصلی مواد کی ناواقفیت ان کو اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہونے دیتی۔کتب خانہ اسکندریہ کی بحث غالباً سب سے پہلے تہذیب الاخلاق میں چھیڑی گئی۔پھر ایک مضمون پانیر میں نکلا اور آج کل متعدد مضامین مختلف اخباروں میں شائع ہوئے۔یہ پچھلے مضامین تو (بجز ایک کے) بیشتر تہذیب الاخلاق کے مضمون سے ماخوذ تھے لیکن وہ پہلا ہی مضمون ہے صرف دو ایک انگریز مورخوں کا مقلدانہ اقتباس تھا۔مزا یہ ہے کہ چوں کہ ایک انگریز مورخ نے جہالت سے لکھ دیا کہ ''علامہ ابن خلدون نے حضرت عمرؓ کے حالات میں کتب خانہ اسکندریہ کا جلایا جانا لکھا ہے۔'' ہمارے معزز مضمون نگار نے خود اس کی تقلید کی اور ابن خلدون پر عبداللطیف بغدادی کی تقلید کا الزام لگایا ہے۔حالانکہ ابن خلدون میں اس واقعہ کا کہیں نام ونشان بھی نہیں۔ہمارے مضمون نگاروں نے جو طرز استدلال اختیار کیا ہے وہ اثبات مدعا کے لئے کافی نہیں۔وہ اپنے دعوے پر دو دلیلیں پیش کرتے ہیں:

(۱) جن کتب خانوں کا نام لیا جاتا ہے حضرت عمرؓ سے پہلے برباد ہو چکے تھے۔
(۲) بطریق اسکندریہ، المیکن، ابوالفدا نے اپنی تاریخوں میں اس واقعہ کا ذکر

نہیں کیا۔

جن مورخوں نے یہ الزام لگایا ہے ان کے بیان کی یہ خصوصیتیں کہ فلاں کتب خانہ جلا دیا گیا اور کئی ہزار حماموں میں تقسیم ہوکر چھ مہینے ایندھن کا کام دیتا رہا، عارضی خصوصیتیں ہیں۔ اصل الزام اس قدر ہے کہ اسکندریہ کا کتب خانہ مسلمانوں کے ہاتھ سے برباد ہوا، جو اس وقت رفع ہوسکتا ہے کہ پہلی دلیل کے ساتھ احتمالات ذیل باطل کئے جائیں۔

(۱) ممکن ہے کہ اسکندریہ میں ان دو کتب خانوں کے سوا اور کوئی کتب خانہ رہا ہو۔

(۲) ممکن ہے کہ ان کتب خانوں کی کچھ کتابیں برباد ہونے سے بچ گئی ہوں جو اسلام کے عہد میں جلائی گئیں۔

(۳) ممکن ہے کہ ان دونوں کتب خانوں کے برباد ہونے کے بعد حضرت عمرؓ کے زمانے تک اسکندریہ میں اور کوئی علمی ذخیرہ مہیا ہوگیا ہو۔

اگر مناظرہ کا معقول طریقہ اختیار کیا جاتا تو ہمارے مضمون نگاروں کو بہت آسانی تھی۔ قاعدۂ استدلال کی رو سے بارِ ثبوت ان لوگوں پر ہے جو ایک واقعہ کا وجود بیان کرتے ہیں۔ ہمارا صرف یہ کام ہے کہ ہم ان لوگوں سے جو کتب خانہ کا جلایا جانا بیان کرتے ہیں، دلیل طلب کریں۔ یہ ظاہر ہے کہ دعوے کرنے والے کوئی سند ایسی پیش نہیں کر سکے ہیں جو اثباتِ مدعا کے لئے کافی ہو۔ لیکن غلطی سے ہم نے اس دعوے کو نفی کی صورت میں خود اپنے ذمہ لے لیا ہے، جس کو ہم کسی طرح ثابت نہیں کر سکتے۔ احتمالات کا سلسلہ ہنوز قائم ہے اور جب تک وہ منقطع نہ ہو دعویٰ ثابت نہیں ہوسکتا۔

دوسری دلیل یعنی دو تین مورخوں نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے اور یہی

ضعیف ہے۔ یورپ کے مورخ جس کثرت سے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہیں اس کے مقابل میں منکرین کی تعداد عشر عشیر بھی نہیں۔ گبن صاحب اور ان کے پیروؤں کا انکار خود قیاسات پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ گبن کے بعد اور مصنفوں نے اس کے انکار پر حقارتانہ تعجب ظاہر کیا ہے۔ اخبار اسپکٹیٹر میں اس بحث کے متعلق دو یورپین فاضلوں کا مناظرہ چھپا ہے جس میں فریق مخالف نے متعدد لائق مصنفوں کے نام گنائے ہیں جنھوں نے گبن کے طرز استدلال کو بالکل باطل کیا ہے۔ مسٹر رینان جو فرانس کا ایک مشہور پروفیسر ہے اس نے اپنے لکچر میں اگرچہ اس واقعہ سے انکار کیا ہے تاہم وہ تسلیم کرتا ہے کہ یورپ کی عام روایتوں میں یہ واقعہ بار بار بیان کیا گیا ہے۔

میں اس وقت اس بحث پر کچھ لکھنا نہیں چاہتا لیکن یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ کس طرح اس بحث کا قطعی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے یہ طے کرنا چاہئے کہ اس روایت کا اصلی مخرج مسلمانوں کی تاریخیں ہیں یا عیسائیوں کی۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے رسول اللہ ﷺ کی آغاز نبوت سے بنوامیہ کے عہد تک اسلام کی کوئی تاریخ عیسائیوں نے بطور خود نہیں لکھی۔ یورپ کی تاریخیں جو اس عہد کے متعلق ہیں وہ تمام تر عربی تاریخوں سے ماخوذ ہیں۔ اس لئے یہ واقعہ بھی یورپ میں پہنچا تو اسلامی ہی روایتوں کے ذریعہ پہنچا ہوگا لیکن ایک انگریز مضمون نگار نے دعویٰ کیا ہے کہ یحییٰ اسکندری عیسائی جو حضرت عمرؓ کے عہد میں تھا اس نے اسکندریہ کی تاریخ میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس روایت کا اصل ماخذ عربی تاریخیں ہیں تو ہم کو ان قدیم عربی تاریخوں کو پڑھنا چاہئے جو محدثانہ طرز پر لکھی گئی ہیں کیوں کہ بعد کی تصنیفیں یا انہیں سے ماخوذ تاریخیں ہیں۔ تاریخ بخاری، فتوح البلدان بلاذری، جو خلیفہ متوکل باللہ کے عہد میں لکھی گئی، تاریخ کبیر ابوجعفر جریر طبری، فتوح مصر، تاریخ

یعقوبی، اگر ان کتابوں میں اس واقعہ کا ذکر نہ ہوتو اس کو محض ایک افسانہ خیال کرنا چاہئے۔

ہم کو امید ہے کہ ناظرین میں سے کوئی صاحب طریقۂ بالا کے موافق اس بحث کو طے فرماویں گے۔اور اگر کسی صاحب نے تکلیف نہ کی تو مجبورانہ ہم کو اپنی محدود واقفیت سے کام لینا پڑے گا۔

(حسن،حیدرآباد، جولائی ۱۸۹۰ء)

[۳]

موجودہ زمانہ میں تاریخ کافن

موجودہ زمانہ میں تاریخ کافن ترقی کے جس پایہ پر پہونچ گیا ہے اور یورپ کی دقیقہ سنجی نے اس کے اصول وفروع پر جو فلسفیانہ نکتے اضافہ کئے ہیں اس کے اعتبار سے ہماری قدیم تصنیفات ہمارے مقصد کے لئے کافی نہیں۔

قدیم تاریخوں کو پڑھ کر اگر یہ معلوم کرنا چاہو کہ فلاں عہد میں طریق تمدن اور طرز معاشرت کیا تھا؟ حکومت اور فصل مقدمات کے کیا آئین تھے؟ خراج ملک کیا تھا؟ فوجی قوت کس قدر تھی؟ ملکی عہدے کیا کیا تھے؟ تو ان باتوں میں سے ایک کا پتہ لگنا بھی مشکل ہوگا۔ خود فرمانروائے وقت کے طور طریقے اور عام اخلاق وعادات کا اندازہ کرنا چاہو تو وہ جزوی حالات اور مفید تفصیلیں نہ ملیں گی جس سے ان کی اخلاقی تصویر ایک بار آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ جن واقعات کو بہت بڑھا چڑھا کر لکھا ہے اور ہزاروں صفحے اس کی نذر کر دئے ہیں وہ صرف تخت نشینی، خانہ جنگیاں، فتوحات ملکی، اندرونی بغاوتیں، عمال کے عزل ونصب کے حالات ہیں۔ یہ واقعات بھی کچھ ایسے عامیانہ طریقے پر جمع کر دئے ہیں کہ ان میں اسباب وعلل کا مرتب سلسلہ معلوم ہوتا ہے نہ ان سے کسی قسم کے دقیق تاریخی نتیجے مستنبط ہو سکتے ہیں۔............تاریخ عالم کا یہ واقعہ بہت سے مختلف واقعات کے سلسلہ میں بندھا ہے۔ ان سے فلسفیانہ نکتہ سنجی کے ساتھ تاریخی نتائج کا مستنبط کرنا بھی ایک چیز ہے جو علم تاریخ کی جان اور روح

ہے اور یورپ کو اس فن کے متعلق جس اختراع و ایجاد پر زیادہ ناز ہے وہ اسی طلسم کی پردہ کشائی ہے۔ اس سے میرا یہ مقصد نہیں کہ اگلے مصنفوں کی کوششوں پر نکتہ چینی کروں۔ ان لوگوں نے جو کچھ کیا موجودہ اور آئندہ نسلیں ہمیشہ اس کی ممنون رہیں گی لیکن زمانہ کا ہر قدم آگے ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ترقی کی جو حد کل مقرر ہو چکی تھی آج بھی قائم رہے گی۔ اس کے علاوہ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہر زمانہ کا مذاق مختلف ہے۔ جن باتوں کو قدما نے اس خیال سے نظر انداز کر دیا کہ یہ ایک جزوی چیز اور عام معمولی باتیں تصنیف کی متانت کے شایاں نہیں آج انہیں کی تلاش ہے کہ اس عہد کی عام معاشرت اور طرز زندگی کا ان سے اندازہ کیا جائے۔ .... آج جو زبان (اردو) ہماری ضرورتوں کی کفیل ہے اس کے خزانے میں قومی تاریخ کا جس قدر سرمایہ ہے ضرورت سے بہت کم ہے۔ اردو اگرچہ دیکھتے دیکھتے ترقی کے بہت سے زینے طے کر گئی اور قریب ہے کہ وہ ایک علمی زبان کے رتبہ تک پہونچ جائے، لیکن علماء کا گروہ جو عربی زبان اور عربی تصنیفات کا مالک تھا اور اس وجہ سے تاریخی ذخیرے بھی گویا خاص اسی کے قبضۂ اختیار میں تھے اس کی طرف مطلقاً ملتفت نہ ہوا۔

تصنیف و تالیف تو ایک طرف، ہمارے علماء اس زبان (اردو) میں خط و کتابت کرنا بھی عار سمجھا کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کچھ ایسی تیزی سے بڑھی کہ بہت سے لوگ اور خصوصاً یہ سادہ مزاج گروہ اس کی رفتار ترقی کا اندازہ بھی نہ کر سکا۔ چونکا تو اس وقت جب وہ (اردو) ملک کی انشا پردازی اور عام تصنیفات پر پورے اقتدار کے ساتھ قابض ہو چکی تھی اور میرا تو یہ خیال ہے کہ ان میں بہت سے اب تک وہی صحرائے عرب اور بہارستان فارس کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ موجودہ نسلیں جنہوں نے حال کی آب و ہوا میں پرورش پائی البتہ اردو کا حق سمجھتے ہیں اور ان کی دلی خواہش ہے کہ اپنی ملکی زبان کو ترقی کے اعلیٰ رتبہ پر پہونچائیں۔ اسی کا اثر ہے کہ ملک میں اردو

انشا پردازی کا ایک عام جوش پھیل گیا ہے اور ہر طرف سے نئی تصنیفات کی صدائیں آ رہی ہیں۔ لیکن چونکہ زمانہ کی پر پیچ ضرورتوں نے اس نئے گروہ کو بہت کم موقع دیا کہ عربی زبان پر دسترس پا سکے اس لئے عربی تصنیفات سے وہ فائدہ نہ اٹھا سکا اور قومی تاریخ کے اصلی خزانے اس کی آنکھوں سے چھپے رہ گئے۔ مجبورانہ پرزور اور ایجاد پسند طبیعتیں جو کسی طرح نچلی نہ بیٹھ سکتی تھیں تذکروں اور ناولوں پر جھکیں جس سے اتنا ضرور ہوا کہ اردو کی وسعت کا ایک قدم اور آگے بڑھا۔ لیکن افسوس اور عبرت کی جگہ ہے کہ جو زبان عربی و فارسی کو ہٹا کر ہماری علمی اور قومی زبان بنی وہ اسی خاصہ سے محروم رہ گئی جو قائم مقامی کی حیثیت سے اس کا ذاتی حق تھا۔ یہی ایک چیز (تاریخ) ہے جو قومی فیلنگ اور قومی جوش کو زندہ رکھ سکتی ہے اور اگر یہ نہیں تو قوم قوم نہیں۔

(۱۔ رسالہ عبرت نجیب آباد۔ جنوری ۱۹۱۶ء)

(۲۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور ج ۵۶ شمارہ ۱۔ مسلسل نمبر ۲۲۴)

---

reform be accepted, be allowed an allowance in the form of an aid.

(THE CONFERENCE OF ORIENTALISTS INCLUDING MUSEUMS AND ARCHEAOLOGY CONFERENCE HELD AT SIMLA July 1911, pp. 47-48)

that they are looked upon with disregard by the Oriental Scholars, because those people who were not actually scholars were honored with them, and in many cases persons who were reallly scholars were deprived of such a boon. If the conferring of such titles is made use of in future in a guarded manner, it would also prove a great encouragement to the Oriental scholars.

3. Some stipends be allowed to authors of profound learning every month.

4. A reasonable reward be fixed for such people who make a discovery or a nice investigation in Literature or History, etc.

5. After making such reforms and developments in the Oriental learning some examination be started which may enable them to be eligible for service.

6. Some reward or stipends be allowed to such persons who may furnish themselves with Historical information in India or out of India by means of travel.

7. Such Oriental institutions, were the proposed

problem positively.

It is an admitted fact notwithstanding the absence of any wolrdly advantages, lots of Indians are exerting themselves with profound interest in the attainment of the Oriental learning,- a feature shared chiefly by philosophers. Under these circumstances it seems advisable that instead of eradicating its existence and replacing it with the modern system of education, such reforms be introduced in it so as to make it more and more useful and serviceable, and the people fond of acquiring such learning may shed forth their lusture as a bright diamond in the garland composed of Europeans Orientalists.

In my opinion the following suggestions seem important from a very point of view:

1. The introduction of such reforms and developments in the Oriental institutions which may be easily acceptable by them and they may not entertain the apprehension of an interference.

2. The titles of Shams-ul-Ulema, etc., conferred by Government, have been made use of in such a manner

[۴]

Education

تعلیم کے سلسلہ میں علامہ شبلی نے کچھ یادداشتیں شملہ کی مستشرقین کانفرنس میں پیش کی تھیں۔ کانفرنس کی روداد میں اس کا انگریزی ترجمہ شامل کیا گیا ہے۔ ملک احمد نواز نے اپنے مضمون ''شبلی اور حالی کی بعض غیر مدون تحریریں'' مطبوعہ صحیفہ لاہور (اکتوبر ۱۹۷۰ء۔ ص ۶۳-۶۴) میں یہ نوٹ بسلسلہ تعلیم نقل کیا ہے مگر اس کا حوالہ نہیں دیا ہے کہ انہیں یہ نوٹ کہاں سے ملا۔ شملہ میں مستشرقین کانفرنس جولائی ۱۹۱۱ء میں ہوئی تھی۔ انہوں نے یہ بھی واضح نہیں کیا کہ شبلی انگریزی نہیں جانتے تھے تو ان کے خیالات انگریزی میں کس نے منتقل کئے۔ بہرحال یہ تعلیم کے سلسلہ میں علامہ شبلی کی ایک اہم تحریر ہے۔

The cultivation and reform of the Oriental branches of learning is a very delicate problem in India, and I am sorry that it has been looked upon with indifference hitherto. The scheme laid out by Dr. Ross inspite of its being very useful, does not solve the

باب دوم

خطبات

[ا]

اظہار تشکر

یہ علامہ شبلی کی اب تک کی دریافت سب سے قدیم تقریر ہے۔ مئی ۱۸۸۲ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس اولڈ فیلڈ کی جگہ سید محمود کا تقرر ہوا۔ یہ ہائی کورٹ کے پہلے ہندوستانی جج تھے۔ اس خوشی میں اعظم گڑھ میں ۳۱ر جولائی ۱۸۸۲ء کو ایک تہنیتی جلسہ منعقد ہوا۔ جلسہ کی صدارت ضلع اعظم گڑھ کے راجہ، راجہ سلامت شاہ [۱۸۳۵-۱۹۱۲ء] نے کی تھی۔ اس جلسہ کے سکریٹری علامہ شبلی تھے، اس میں اعظم گڑھ اور قرب وجوار کے عمائدین اور روٴسا نے شرکت کی تھی جن کے نام یہ ہیں:

راجہ سلامت شاہ، مرزا قمر الدین منصف، مولوی انعام اللہ خاں، منشی محمد اکرام وکیل سرکاری، اسد اللہ وکیل عدالت، شاہ عبدالعلیم وکیل، شاہ عبدالقدیر وکیل، مولوی توجہ حسین وکیل، منشی چھیدی لال سررشتہ دار، شاہ زادہ عالی قدر مرزا احسن بخت پیش کار، شیخ حبیب اللہ وکیل، بابو محمد اصغر خاں رئیس سدھاری، خواجہ مولوی ولی اللہ خاں رئیس شہر، خواجہ احسن اللہ خاں رئیس شہر، سید محمد قائم رئیس محمد آباد گہنہ، شاہ شجاعت عالم رئیس مئو، مولوی محمد شبلی نعمانی۔

اس موقع پر دیگر مقررین کے ساتھ علامہ شبلی نے بھی تقریر کی تھی جو مورخہ ۱۵راگست ۱۸۸۲ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی مگر خطبات شبلی مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی میں شامل نہیں ہے۔

واضح رہے کہ اس تقریر کی دریافت کا سہرا پروفیسر اصغر عباس صاحب سابق صدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سر ہے۔ انہوں نے اپنے ایک مفصل نوٹ کے ساتھ اسے ماہنامہ کانفرنس گزٹ علی گڑھ اکتوبر ۲۰۱۱ء میں شائع کیا ہے۔ ہم ان کے شکریہ کے ساتھ یہاں درج کرتے ہیں۔

''آج میں گورنمنٹ کا ضرور ممنونِ احسان ہوں۔ مگر گورنمنٹ کا احسان آج کے موقع پر کچھ زیادہ ذکر کرنے کے لائق نہیں کیوں کہ میرا یقین ہے کہ گورنمنٹ نے ہمیشہ نہایت راستی سے اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ جب ہم لوگ کسی منصب کی لیاقت پیدا کریں گے تو وہ کبھی ہم کو اس سے محروم نہ رکھے گی۔ پس اس کا یہ احسان ہمیشہ سے ہے اور اس نے کوئی نئی حالت نہیں پیدا کی ہے۔ میں آج اس بات کا زیادہ ذکر کروں گا کہ مسلمانوں نے وہ لیاقت پیدا کر لی ہے جس کے مدتوں سے منتظر تھے اور اس لئے میں اس نام ور شخص سید محمود کو مبارک باد دوں گا اور حضور لفٹننٹ گورنر بہادر کا شکریہ ادا کروں گا کہ انہوں نے سید صاحب کی لیاقت کا پورا پورا اندازہ کیا اور جو منصب کہ ان کے شایانِ شان تھا ان کو عطا فرمایا۔ گو مجھ کو تسلیم ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کی رفتار تیز ہوتی جاتی ہے اور ان کا بختِ خفتہ اب کروٹیں لینے لگا ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اب بھی بہت سے مسلمان اپنے کہنہ خیالات کی گہری تاریکی سے نہیں نکلے اور ہنوز وہ بے ہودہ تقلید اور راہ و رسم عام سے وابستہ ہیں۔ گورنمنٹ نے ان کو ترقی کے

زینہ تک پہنچا ہی نہیں دیا تھا بلکہ اپنا ہاتھ بڑھا کر ان کو اوپر لینا چاہا مگر وہ اپنے انہیں بے ہودہ خیالات کے دباؤ سے جگہ سے ہل بھی نہ سکے۔ سید محمود صاحب ہی مسلمانوں میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس بات کو نہ صرف خیالی بلکہ عملی طریقہ میں ثابت کر دکھایا کہ مسلمانوں کی ترقی اب ان کے ہاتھ میں ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ سید محمود صاحب کی تقریری سے ترقی کا جو خیال مسلمانوں کے رگ و ریشہ میں دوڑ گیا ہے اور جس قدر کہ اس موجودہ نتیجہ کو دیکھ کر وہ میدان ترقی میں نہایت تیزی کے ساتھ بڑھ جانے کے لئے آمادہ ہو گئے ہیں۔ اس قدر تحریک ان مجلسوں اور سوسائٹیوں سے بھی نہیں حاصل ہوئی ہے جو اس وقت تک اس غرض کے لئے گورنمنٹ یا مصلحانِ قوم کی طرف سے منعقد ہوتی رہی ہیں۔ اگر گورنمنٹ کا بھی تقرری سے یہی مقصود ہے تو غالباً کوئی دوسری پالیسی اس کی ہم سری نہیں کر سکتی اور یقیناً مسلمانوں کے مردہ اور افسردہ دلوں کے ابھارنے کے لئے اس سے بہتر کوئی آلہ نہیں ہے۔ مسلمان تو جہالت میں لمبی نیند لے رہے ہیں۔ یہ توقع کہ وہ ایک خفیف تحریک سے بیدار ہو جاویں گے، بالکل بے سود ہے۔ سید محمود کی تقرری میں اکبر کی پالیسی کی چمک بھی موجود ہے جس کا منشا یہ ہے کہ پولٹیکل معاملات کے قصر عالی شان کی بنا ہندوستانی ارکان پر قائم کی جاوے۔ خوشامد اور بات ہے مگر ممالک مغربی وشمالی کے عام باشندے اس بات کو ضرور حسرت وافسوس کی نگاہ دیکھتے تھے کہ جس مجموعی جلسہ کے ہاتھ میں لاکھوں کی جانیں ہوں ان میں ہماری قوم کا ایک شخص بھی نہ موجود ہو۔ اس امر کی نسبت ایک مطبعانہ شکایت ضرور دلوں میں بلکہ بعض زبانوں پر بھی موجود تھی۔ سید محمود کی تقرری سے صرف یہی مطلب نہیں پورا ہوا بلکہ خاص مسلمانوں کی ایک دوسری شکایت کا سد باب بھی ہو گیا۔ جیسا کہ مسلمانان کلکتہ کی عرض داشت میں ذکر کیا گیا ہے۔ مسلمان اس بات کو بھی دل میں رکھتے تھے کہ مقدمات شرعیہ میں پوری تحقیقی موشگافی صرف ایک مسلمان شخص ہی سے

ممکن ہے۔ پس سید محمود کی تقرری صرف ایک خیالی خوشی کا باعث نہیں ہے بلکہ اس کا اثر واقعات پر بھی ایک وسیع اور معتد بہ اثر ہے۔ اخیر میں اپنے بیان کو ان فقروں پر ختم کروں گا ''سید محمود تو مبارک، تجھ کو تیرا عہدہ مبارک تو اپنے کو ایسا ثابت کر کہ گورنمنٹ تجھ سے بہتر کوئی شخص انتخاب نہ کر سکے۔ دیکھ ہوشیار رہ تیری رفتار میں لغزش نہ آئے۔ تجھ پر ہزاروں کی نگاہیں بلند رہیں۔''

اخیر میں سکریٹری (شبلی) نے اس بات کی تحریک کی کہ ایک شکریہ تحریر حضور نواب لفٹننٹ گورنر بہادر کی خدمت میں اس مجلس کی طرف سے ارسال کی جاوے اور روئداد جلسہ اخباروں میں مشتہر کرنے کے لئے صاحبانِ اخبار کی خدمت میں مرسل ہو۔ جناب شاہ عبدالعلیم صاحب رئیس محمد آباد وکیل عدالت نے اس تحریک کی تائید کی۔ صدر انجمن صاحب نے رضامندی ظاہر فرمائی اور بالاتفاق منظور ہوئی۔ اخیر میں سکریٹری نے صدر انجمن کا شکریہ تمام انجمن کی طرف سے ادا کیا اور جلسہ برخاست ہوا۔''

[۲]

یوروپین سائنس ولٹریچر

ایجوکیشنل کانفرنس میں علامہ شبلی نے مندرجہ بالا موضوع پر پہلے قرار داد پیش کی پھر تقریر کی۔ یہ قرار داد اور تقریر خلاصہ کارروائی یازدہ سالہ من ابتدائے ۱۸۸۶ء لغایت ۱۸۹۶ء محمڈن اینگلو اورینٹل کانفرنس مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ ۱۸۹۷ء میں شامل ہے۔ ہم نے اسے صحیفہ لاہور اکتوبر ۱۹۷۱ء سے نقل کیا ہے۔ عنوان بھی ہمارا ہی طے کردہ ہے۔

''اس جلسہ کی رائے میں مسلمانوں کو یوروپین سائنس ولٹریچر میں نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ قوم اور گورنمنٹ دونوں کو اس پر توجہ کرنی چاہیے۔ انگریزی کالجوں میں مشرقی زبان کا بطور سیکنڈ لینگوئج کے رہنا کافی ہے۔ خاص مشرقی علوم کی نسبت ہم کو گورنمنٹ کی توجہ درکار نہیں ہے۔ وہ جس طرح کہ ہمارے قدیم طریقہ پر ہماری قوم کے عالموں کے ذریعہ سے ہوتی ہے اس کو اسی طور پر رہنا چاہیے اور خود ہماری قوم کو اس کے باقی اور قائم رہنے پر ایسے لوگوں میں جو اس کی خواہش رکھتے ہیں توجہ رکھنی لازم ہے۔ مشرقی علوم جو مسلمانوں میں قدیم سے اب تک رائج ہیں وہ مذہبی تعلیم اور مذہبی مسائل سے ایسے مخلوط ہیں کہ جدا نہیں ہو سکتے اور اس لئے

گورنمنٹ کواس کا اختیار کرنا مناسب نہیں ہےاور اگر مذہبی مسائل کواس سے خارج رکھا جاوے تو کوئی شخص جو مشرقی علم کا خواہاں ہے اس کو پسند نہیں کرے گا اور اگر کسی وجہ سے اس کو اختیار کرے گا تو مسلمان کمیونٹی میں اس کی کچھ وقعت نہ ہوگی۔''

''انگریزی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کی نہایت ضرورت ہے۔'' ایک ایسا دعویٰ ہے جو اپنے ثبوت میں دلیل کا بہت کم محتاج ہے۔ گورنمنٹ کے صیغۂ ملازمت میں ہمارا بہت کم حصہ ہے۔ ہم اپنے حقوق کے ظاہر کرنے کا کوئی معقول ذریعہ نہیں رکھتے۔ ہمارا کوئی قومی اخبار نہیں ہے جو گورنمنٹ کی زبان میں گورنمنٹ کو ہمارے مقاصد سے مطلع کرے۔ لیکن جب پوچھا جائے کہ ایسا کیوں ہے تو یہی ایک جواب ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے نہ ہونے سے۔ ہماری سوشل اور مارل زندگی بھی بالکل بے ترتیب ہے۔ ہر ایک قوم میں جس کو حکومت کے ساتھ کچھ امتدادا حاصل ہو اس کے علوم اور خاندانی روایتوں کی بنا پر اخلاق اور معاشرت کا ایک بااصول سلسلہ تیار ہو جاتا ہے اور اسی لحاظ سے ہماری قوم کے پاس بھی جو ایک مدت تک تیغ وقلم دونوں کی مالک تھی ایک مجموعۂ اخلاق موجود تھا لیکن جب کسی قوم کے ہاتھ سے حکومت جاتی رہتی ہے تو اس کے اخلاق و معاشرت پر بھی زوال آجاتا ہے۔ یہی حال ہمارا ہوا۔ ہماری اخلاقی زندگی بالکل بے ترتیب ہوگئی ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ ہم اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم حاصل کریں۔ اور وہی سچائی، آزادی، دلیری، بلند ہمتی، اوقات کی پابندی، محنت شعاری سیکھیں جو مغربی تعلیم کا ایک لازمی اثر ہے۔ علمی ترقی جو زندگی کا اصل مقصد ہے وہ یورپین اعلیٰ تعلیم پر موقوف ہے۔ یورپ میں علوم وفنون کو جو ترقی حاصل ہے اس کے سامنے پچھلی ترقیوں کا ذکر کرنا بے سود ہے۔ ایسی حالت میں ہماری علمی ترقی کے لئے مشرقی زبان دانی کافی نہیں ہے اور ضرور ہے کہ نہایت وسعت کے ساتھ قوم میں اعلیٰ تعلیم پھیلے جو گورنمنٹ ہماری تمام ضروریات زندگی کی ذمہ دار ہے جس نے ہمارے

امن و آرام کے لئے سڑکیں، ریل، تار، نہریں، شفا خانے قائم کئے ہیں اس کا فرض ہے کہ ہمارے دماغ کو بھی پوری ترقی دے جو صرف اعلیٰ درجہ کی تعلیم سے ہو سکتی ہے۔ گورنمنٹ کو مشرقی علوم کی تعلیم اپنے ہاتھ میں نہیں لینی چاہیے بلکہ اس کا فیصلہ کرنا خود ہمارے ہاتھ میں ہے کہ مشرقی زبان کے سیکھنے کی ہم کو کس قدر ضرورت ہے۔ مشرقی تعلیم مذہبی تعلیم کے ساتھ ایسی مخلوط ہو گئی ہے کہ اگر اس سے جدا کی جائے تو وہ علوم بے اثر و کم وقعت رہ جاویں اور ایسی حالت میں مسلمان اس کی قدر نہیں کریں گے۔

[۳]

ختم نبوت

ندوۃ العلماء کا نواں سالانہ اجلاس امرت سر میں منعقد ہوا تھا
علامہ شبلی نعمانی اس میں شریک ہوئے تھے اور ختم نبوت کے عنوان سے
خطاب کیا تھا۔ اس خطبہ کی تلخیص اور روداد وکیل امرت سر کے ۱۷/
اکتوبر۱۹۰۲ء و ۲۷/اکتوبر۱۹۰۲ء کے ایڈیشن میں شائع ہوئی ہے۔

''سوا آٹھ بجے کے قریب مولانا شبلی اپنی جگہ سے اٹھے اور ''ختم نبوت'' پر موعودہ تقریر کرنے کے لئے، جس کے اشتیاق میں گویا جمیع حاضرین جلسہ ہمہ تن انتظار بیٹھے تھے، سٹیج پر تشریف لائے۔

اول آپ نے بطور تمہید تبدیل نظام دریوزہ کا ذکر کیا۔ پھر کچھ ''عرض حال'' عذرِ علالت وغیرہ۔ بعد اس کے فرمایا کہ ختم نبوت ایک ایسا وسیع مضمون ہے جس سے کماحقۂ بحث کرنے کو بڑی مہلت چاہئے۔ بحالیکہ یہاں اپنی حالت اور ضیق وقت طوالت کو مانع ہے۔ تاہم بخیال ایفائے وعدہ نہایت ہی مختصر طور پر کچھ عرض کرتا ہوں۔ باوجود یکہ مولانا بوجہ ناسازی طبع واقعی عذر علالت میں حق بجانب تھے اور بار بار فرماتے بھی جاتے تھے کہ ایسی حالت میں اس اہم مضمون کا جیسا چاہئے حق ادا نہیں ہوسکتا، پھر بھی ان کی فاضلانہ ومحققانہ جادو بھری تقریر میں وہ اثر تھا کہ باید وشاید

سامعین بالکل خاموش ہمہ تن گوش بنے مولانا کی طرف ٹکٹکی باندھے سن رہے تھے لیکن اس خاموشی کے عالم میں بھی بارہا مولانا کا حسن بیان اس بات پر مجبور کر دیتا تھا کہ ہر سکوت کو توڑ کر سبحان اللہ، مرحبا، جزاک اللہ کہہ کر فاضل مقرر کو داد دیے بغیر نہ رہیں۔ وکیل کے رپیریزینٹیٹو کی عجیب کیفیت تھی۔ مولانا کی دلآویز اسپیچ کا تقاضا یہ کہ کاغذ قلم چھوڑ کر نقش حیرت بنے مولانا کی صورت کو تکے جایئے اور ان کی آواز کو جو لوگوں پر عامل مسمریزم کا سا اثر ڈال رہی تھی یک سو ہو کر سنے جایئے۔ ادھر مقتضا منصبی یہ کہ ساری تقریر بالفاظ نہ ہو سکی تو کم از کم خلاصۂ مطلب کے طور پر کچھ نوٹ ہی کر لئے جائیں۔ ناظرین قیاس فرما سکتے ہیں کہ یہ کیسی دقت کا سامنا تھا۔ یا تو تقریر کا لطف ہاتھ سے جائے یا شمولیت جلسہ کی غرض و غایت۔ ایسی حالت میں مولانا کی تقریر کا جو کچھ بھی لب لباب ہدیۂ ناظرین ہو سکے غنیمت سمجھنا چاہیے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ جن احباب نے وہ تقریر خود اپنے کانوں سنی ہے انہیں اس پریشان اور غیر مسلسل بیان میں کچھ مزا نہ آئے گا مگر خیر جو حضرات اس وقت کسی وجہ سے جلسہ میں تشریف نہ رکھتے تھے انہیں ذرا دور لطف آ ہی جائے گا۔

فرمایا کہ ''ندوہ کی ضرورت میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا اور اگرچہ اس کی ضرورت ثابت کرنے کا یہ وقت نہیں ہے تاہم اس کی اہمیت ہمیں ہر وقت یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ اس کی حقیقت و ماہیت، اس کے قیام کی اشد ضرورت اور یہ کہ اس کی ضروریات کیا کیا ہیں اور مسلمانوں کی کیسی کیسی امیدیں اس سے وابستہ ہیں؟ یہ باتیں قوم کے اچھی طرح ذہن نشین ہونی چاہیں۔ تب اس کے وجود سے قوم کو مطلوبہ فوائد اور اہم نتائج حاصل ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب تک کسی چیز کی اصلیت اور وقعت ہی انسان کے دل میں نہیں جمتی تب تک نہ وہ اس کی جانب پوری توجہ کر سکتا ہے نہ اس سے کماحقہٗ مستفید ہونے کی کوشش۔ اسی وجہ سے بہت سی اہم

تجاویز اور عظیم الشان کاموں کے متعلق بعض افراد قوم کی امیدیں موہوم ثابت ہوتی ہیں اور جن کا وجود غیر ضروری و بے سود۔

فرمایا کہ قیام ندوہ کے وقت مسلمانوں کے دو گروہ تھے۔ علمائے کرام کے حالات و خیالات اس کے بارہ میں کچھ اور تھے۔ جدید الخیال لوگوں کے کچھ اور۔ اور دونوں کی رایوں میں اختلافِ عظیم۔ مگر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ سارے ہی بڑے کاموں میں ابتداً ایسا ہوا کرتا ہے، لیکن ان اختلافات اور ابتدائی مشکلات کی وجہ سے اولوالعزم گھبرا نہیں جایا کرتے۔ اور اسلام میں تو ایسے اختلافات کو رحمت بتایا گیا ہے۔ اس کی تو تعلیم ہی یہ ہے کہ اس قسم کے موقعوں سے روشن خیالی، تحمل، حوصلہ اور استقلال کو کام میں لا کر فائدہ اٹھایا جائے۔ اسی پاک اور قابلِ تقلید طرز عمل کی بدولت سلف صالحین کے مبارک زمانوں میں قوم کو بڑے بڑے عظیم الشان فوائد حاصل ہوتے رہے۔ اسی شیوۂ محمود کے طفیل ابتدائے اسلام اور اس کی چند شروع کی صدیوں میں مسلمانوں سے وہ وہ کام بن پڑے جن کی نظیر زمانہ بعد کے صدہا سالوں میں بھی نہ لا سکا اور نہ لا سکے گا۔ اس موقع پر مولانا نے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے سبق آموز عجیب وغریب حالات، جمع قرآن کی کیفیت، زمانہ صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) میں جمع احادیث کی ضرورت، علوم تفسیر وفقہ وغیرہ کی تدوین، علوم یونان اور روم وشام وغیرہ کے عربی تراجم، ادب عرب کا ابتدائی زمانہ، پھر اس میں اقوام غیر کے علوم کا اضافہ اور بالآخر لسان العرب کے انواع، علوم فنون کے خزائن سے مالا مال ہونا وغیرہ وغیرہ بیان فرما کے کہا کہ سلف نے تو اپنے زمانہ میں ضرورت وقت کو اچھی طرح سمجھا اور اس کو پورا کرنے کا حق ادا کر گئے لیکن زمانہ دن بدن ترقی پر ہے۔ اس کی ضروریات بھی ہمیشہ بڑھتی جاتی ہیں اور حالت موجودہ ہم سے بزور یہ کہلواتی ہے کہ اب بھی اسی طرح ہمیں اصلاح وترقی علوم وفنون کی از بس احتیاج ہے۔ پس سلف کی

طرح ہمارا بھی یہ فرض ہے کہ غیر اقوام کے علوم وفنون سیکھیں۔

اس موقعہ پر آپ نے ایک نہایت اہم نتیجہ پر زور دیا۔ وہ یہ کہ میرے پچھلے بیان کا بہت ہی ضروری ماحصل یہ ہے کہ اس مبارک زمانہ کے علمائے اسلام نے دوسری قوموں کے علوم وفنون کو اپنی زبان میں لینے سے ہرگز تعصب نہیں کیا۔ اگر کسی کے ذہن میں یہ خیال فاسد ہو تو تاریخ شاہد ہے، جو بڑی زبردست نظیروں سے اس کی تردید کرتی ہے۔ مسلمان اگر تعصب برتتے تو یونانی فلسفہ اور سائنس کی تحصیل میں شاقہ محنتیں کیوں اٹھاتے؟ مگر انہوں نے ان علوم کو بشوق و رغبت سیکھا اور ایسا سیکھا جیسا سیکھنے کا حق ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے علم کلام کو بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ انہوں نے غیر اقوام کے علوم سے فائدہ اٹھانے میں کس فراخ دلی اور بے تعصبی سے کام لیا ہے اور کیوں نہ لیتے؟ ان کے نزدیک تو علم مومن کی کھوئی ہوئی دولت تھی کہ جہاں پائے اٹھا لینی چاہئے۔ وہ اسلام کو خدانخواستہ کسی پہلو سے کمزور اور بودا بھی نہ جانتے تھے جو اس ڈر کے مارے ان علوم سے اجتناب کرتے کہ کہیں یہ (علوم) اسلام کو کسی طرح کا گزند نہ پہنچائیں یا ان کے مقابلہ میں اسلام کے اصول وعقائد کی بنیادیں متزلزل نہ ہو جائیں۔ معاذ اللہ۔ جیسے زمانۂ حال کے بعض علما کا یہ خیال ہے کہ مذہب میں عقل کو دخل نہ دو۔ یہ مانا کہ تنہا عقل کی روشنی کافی نہیں ہوسکتی مگر نعوذ باللہ ایسا بھی تو نہ ہو کہ اسلام کو خلاف عقل (غیر معقول) سمجھا جائے بحالیکہ عقل ہی کی وجہ سے انسان اس سارے بار کا مکلّف ہے۔ سلف صالحین کے بھی اگر یہی خیالات ہوتے اپنے دعاوی عقائد کو دلائل عقلیہ سے کیوں ثابت کرتے؟ معقولات سے اسی طرح نہ بچتے تو جس طرح اسلام کے نادان دوست دور بھاگتے ہیں۔ شرح موافق کو دیکھو اس کا دو تہائی سے زیادہ حصہ علوم یونان سے ماخوذ ہے۔ پھر یہ کہ جن علوم کو ہم نے غیر قوموں سے لیا ان کو اپنا سمجھ کر ان کی حفاظت وحمایت کی۔ چنان چہ اس کا ثبوت اب

تک یہ حال ہے کہ اگر کوئی طب یونانی کو برا کہے تو ہمیں ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ گویا کہ وہ ہماری اپنی چیز ہے۔ یہی تو باتیں تھیں جن کی وجہ سے مدت قلیل کے اندر اندر مسلمانوں کا چار دانگ عالم میں ڈنکا بج گیا اور ان کے بین کارناموں کا اک زمانہ اب تک اعتراف کرتا ہے۔

مگر ناظرین میری تقریر سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ علمائے اسلام میں علوم کی وہ پیاس نہیں ہے جو اس زمانہ میں تھی یا یہ کہ علما ان علوم جدیدہ سے کچھ بیر یا تعصب رکھتے ہیں، نہیں نہیں بلکہ حقیقت میں بات اور ہی ہے۔ وہ یہ کہ علم وفن جسے کہتے ہیں یورپ میں اس کا نام نہیں۔ آج اگر اس غلط فہمی یا لاعلمی کا پردہ ہٹ جائے تو اسی شوق و سرگرمی سے علوم مغربیہ کی تحصیل پر متوجہ ہو جائیں جیسے اسلاف ہوئے تھے۔ پس اب ضرورت کا ہے کی ہے؟ یہی کہ علما کو کسی طرح آگاہی ہو۔ انہیں پتہ لگے کہ یورپ اس وقت علمی خزانوں سے مالا مال ہے۔ مسلمان ہند اس امر سے بے خبر ہوں تو ہوں اب تو بعض ممالک اسلامیہ میں بھی السنہ یورپ کی کتب کا ترجمہ ہو رہا ہے مثلاً بلاد شام ومصر و بیروت وغیرہ۔ دیگر علوم کو جانے دو، وہ خود آپ کی عربی کا علم جس قدر وہاں ہے ہم میں نہیں۔ مجدالدین فیروز آبادی کی قاموس لغت کی سب سے اخیر کتاب ہے۔ سب سے اول کتاب میں چالیس ہزار مادے تھے، پھر ساٹھ ہزار ہوئے، اب لسان العرب میں اسی ہزار مادے ہیں اور اس پر بھی ہزار ہا ایسے الفاظ کا اضافہ ہو گیا اور ہوتا جاتا ہے کہ جن کا ہماری کتب لغت میں کہیں پتہ نہیں چلتا۔ پس زبان عربی اور علوم اسلامی کی روز افزوں ضروریات پر متوجہ ہونے کی کیسی سخت احتیاج ہے۔ مگر افسوس ہم سے تو کچھ ہو نہیں سکتا ہاں غیر اقوام البتہ اس نعمت اور سعادت سے خوب حصہ لے رہی ہیں۔ نہ صرف اپنا بلکہ ہمارے حصہ کا بھی۔ یوپ کی علمی سوسائٹیوں نے عرب جاہلیت کے اشعار کو کس کس تلاش وجستجو سے بہم پہونچایا ہے۔ جرمنی میں کتب عربیہ کے انطباع اور

ترجمہ وغیرہ میں کیسا کچھ اہتمام کیا گیا ہے۔ پڑھ پڑھ کر عقل حیران ہوتی ہے اور اپنی قومی پستی اور کم حوصلگی پر رونا آتا ہے۔

پس اے مسلمانو! ابونصر فارابی اور بوعلی سینا وغیرہما نے جس طرح فلسفہ یونان کے مقابلے پر اسلامی علم کلام کا ایجاد کیا تھا۔ اسلام کی حمایت وحفاظت اور اہلِ اسلام کی اصلاح وترقی کے لئے اب بھی ویسا ہی ہونا ممکن ہے بشرطیکہ پہلے علوم یورپ سے آگاہی حاصل کریں۔

یہی اہم مقاصد ندوہ کی غرض وغایت ہیں۔ انہی سے بخوبی واقف ہونے پر بعض لوگوں کا یہ اعتراض اٹھایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے دیگر موجودہ انسٹی ٹیوشنوں سے بڑھ کر اردو کا وہ کون سا انوکھا مقصد ہے؟ ہمیں اس بات کا اعتراف اور افسوس ہے کہ ان مقاصد میں ندوہ کو اب تک کوئی نمایاں کامیابی نہیں ہوئی مگر اس میں ندوہ کی کچھ خطا نہیں۔ یہ ہمارا اپنا قصورِ ہمت ہے یا عدمِ فرصت اور یہ بدظنی کہ یورپ علوم سے تہی دست ہے۔ ان موانع کے ہوتے اس قلیل مدت میں کوئی بہت ہی زبردست کارنامہ نہ دکھلا سکنے پر ندوہ معذور سمجھا جانا چاہئے۔ ہماری قوم میں اس وقت دو گروہ ہیں، کاروباری اور علمی۔ دونوں کے مشاغل مختلف ہیں۔ قومی ترقی کا اصل اصول تو یہ ہے کہ اس کے افراد میں کاروباری اشغال سے واسطہ رکھنے والے ہوں تو ساتھ ہی ساتھ علوم وفنون کو ترقی دینے والے بھی ہوں۔ برخلاف اس کے ہمارے نوجوانوں میں مادی ترقی کا شوق ہے تو دین اور علوم وفنون کی طرف سے بے اعتنائی۔ یہ خرابی نہ ہوتی تو ندوہ کی ضرورت ہی کیا تھی؟ چاہیے کہ علم اپنی غرض وغایت آپ ہی سمجھا جائے۔ ندوہ کو ایسے ہی طالبان علم کی ضرورت ہے اور اسی قسم کے خادمانِ علوم وفنون وہ پیدا کیا چاہتا ہے۔

اس وقت تقریباً پونے نو بجے تھے کہ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر واپس تشریف

لے گئے۔ مولانا کی تقریر کا مندرجہ بالا حصہ حقیقت میں بطور تمہید تھا اور اصل مضمون پر جو کچھ آپ نے فرمانا تھا، وہ آگے آتا ہے۔

اول آپ نے **ماکان محمد ابا** ....کی تفسیر فرمائی۔ پھر اس اہم ترین مسئلہ میں اپنی ہیچ مدانی کا اقرار، پھر شاہ عبدالعزیزؒ پر سلسلہ محدثین کا ختم ہونا۔ یہاں آپ نے شعر

اے فخرِ رسل قرب تو معلوم شد

دیر آمدۂ راہ دور آمدۂ

سے علوشان محمدی (علیہ الصلوٰۃ السلام) کی توضیح فرمائی۔ بعد ازاں فرمایا کہ ہر کمال کے بعد زوال ہوتا ہے۔ تمام کمالات کی ترقی کی ایک خاص حد پر جا کر ٹھہر جاتی ہے۔ چناں چہ قمر کی مثال سے بخوبی واضح ہے کہ اس حدِ خاص سے آگے جو بدر کی حالت میں ہوتی ہے، مزید کمال ظہور میں نہیں آسکتا۔ اسی کے ضمن میں آپ نے خطِ مستقیم کی مثال دے کر بتایا کہ جس طرح دو نقاط کے مابین قریب ترین فاصلہ خطِ مستقیم ہی ہوتا ہے ایسے ہی انسان کے لئے جو راہ ہدایت اسلام نے بتائی وہی صراط مستقیم ہے۔ گویا **الیوم اکملت لکم دینکم** فرما کر خود اللہ تعالیٰ نے یہ امر بوضاحت بتلا دیا کہ بعثت انبیاء کی جو غرض و غایت تھی وہ آج ہم نے پوری کر دی۔ اب اس (دین اسلام) سے زیادہ کامل و مکمل اور کوئی دین ہو نہیں سکتا۔ فرمایا یہ لطیفہ میرا اپنا اختراع نہیں بلکہ شریعت محمدیہ **(علی صاحبھا الصلوۃ والسلام)** کا ہر پہلو سے حدِ اعتدالی پر واقع ہونا اس واقع نفس الامر کا بین ثبوت ہے۔ فرمایا اسی لئے قرآن شریف کے شروع ہی میں بندوں کو صراط مستقیم مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ کیوں کہ یہی منتہائے ہدایت ہے اور یہی مقصود و مدعائے نبوت۔ چوں کہ سابقہ شریعتیں اس بارہ میں ناقص و غیر مکمل تھیں اور اسلام نے آکر اس کمی کو پورا کیا، اس واسطے پیروان اسلام کو سب سے پہلے یہی دعا کی تعلیم فرمائی گئی۔

فرمایا مذہب کے اجزاءعظیم دو ہیں، معتقدات اور اعمال۔ اب یہ دیکھنا چاہئے کہ اسلام کے ان دونوں اجزا میں ایسی کیا خصوصیت ہے جو اس کو دوسرے مذاہب پر فوقیت دیتی ہے۔ اولاً استقامت کولو۔ کسی اور مذہب نے اپنا عقیدہ عقل سے منوانے کا ادعا نہیں کیا۔ جس مذہب کی چھان بین کرو یہی پاؤ گے کہ وہ خود دلائل نہیں دیتا بلکہ اس کے حامی اس کی معقولیت ثابت کرنے اور حقیقت کے دلائل پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو بڑی تحدی کے ساتھ اپنی معقولیت وحقیقت کا ادعا کرتا اور اس کے دلائل و براہین بھی پیش کرتا ہے۔ یہاں آپ نے ضمناً ایک نہایت اہم نکتہ فرمایا کہ ہمارے علم کلام میں لوگوں نے یہ بڑا بھاری نقص پیدا کر دیا ہے کہ دوراز کار استدلال سے کام لیتے ہیں اور خود قرآن کریم نے جو بین دلائل دئے ہیں انہیں اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ حالاں کہ ان کے آگے اور سب دلیلیں ہیچ ہیں۔ قرآن میں اسلام کے سارے ہی عقائد پر دلائل موجود ہیں۔ وہ کوئی بات تقلیداً نہیں منواتا۔ اسلام نے عقل کو بے کار و معطل نہیں بتایا مگر جملہ امور پر حصر بھی نہیں رکھا کیوں کہ عقل انسانی دراصل تمام متعلقات دین پر حاوی ہے ہی نہیں بلکہ ایک خاص حد پر پہنچ کر اس کا عجز ثابت ہو جاتا ہے۔ پھر فرمایا کلام خواجہ کی فہم ممکن ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ ضرور نہیں کہ اس کی نظیر لانے پر بھی قدرت ہو۔ یہی حال اسلام کا ہے۔ فرمایا مذہب کا ایک جزو اعظم اک برترین قوت کا اعتراف ہے جو مقتضائے فطرت ہے۔ اور مثل دیگر جذبات فطرت کے کل بنی نوع انسان میں مشترک ہے۔ باستثنا ملاحدہ ہر بشر کو طوعاً وکرہاً اس ہستی کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ اس مقام پر مولانا نے نہایت خوش اسلوبی وحسن بیان سے توحید فی الذات، توحید فی الصفات، احوال مشرکین عرب کی توضیح کر کے فرمایا کہ توحید فی الذات پر ایمان لانا اور پھر شرکت فی الصفات کا بھی عقیدہ رکھنا توحید خالص کے منافی ہے۔ پھر توحید خالص قبل

از اسلام اور اوتاروں کی اصل بیان فرما کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر کیا کہ کفار آپ پر تعجب کرتے تھے کہ یہی خدا کا رسول ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا، چلتا پھرتا ہے اور تمام لوازمات بشریت اس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ دیگر انبیاء علی نبینا و علیہم الصلوۃ والسلام میں سے کوئی کلیم اللہ کہلائے، کوئی روح اللہ مگر ہمارے رسول کریمؐ رسول اللہ کے معزز لقب سے ملقب ہوئے۔ پھر نماز میں پنج وقتہ ان کی رسالت کے ساتھ ہی عبودیت کا بھی اقرار تعلیم کیا گیا۔ اس میں بڑی حکمت یہ تھی کہ مبادا امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خوش اعتقاد لوگ کسی زمانہ میں جا کر اوتاروں والی قوم کی طرح شرک کے مرتکب نہ ہو جائیں۔

دیگر طویل توضیحات سے بوجہ ضیق وقت قطع نظر کر کے اب آپ نے دوسرے اسٹپ یعنی عبادات کو لیا۔ اس کے ضمن میں معاملات یعنی حقوق العباد کی تشریح کی۔ پھر فرمایا کہ مفہوم عبادت میں بعض لوگ غلط فہمی کرتے ہیں۔ منشا احکام عبادت دراصل یہ ہے کہ بندوں کی تطہیر ہو۔ خداوند تعالیٰ ہماری بندگی کا کچھ محتاج نہیں نہ وہ ہمیں معرضِ امتحان اور ابتلا میں ڈالنا چاہتا ہے۔ راہبوں وغیرہ نے منشا الٰہی کو ٹھیک نہ سمجھا کہ اپنے اوپر مجاہدات شاقہ لازم کر لئے۔ پھر فرمایا کہ اہلِ یورپ کے دلوں میں آج کل ایک عجیب خبط سمایا ہے۔ وہ جمیع مذاہب موجودہ سے بدظن ہو کر ایک جدید مذہب کی ضرورت سمجھتے ہیں اور اس کی ایجاد کے منصوبے کا ذکر سنتے ہیں۔ چناں چہ ایک فلاسفر تجویز کرتا ہے کہ مذہب میں ان تین صفات کا ہونا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ اس میں محنت شاقہ نہ ہو۔ دوسرے وہ انسانی عقائد پر مبنی ہو۔ تیسرے خدا کی اس سے کوئی غرض وابستہ نہ ہو۔ اسلام کی عبادات میں یہ اور اسی قبیل کی تمام خوبیاں پہلے ہی سے موجود ہیں۔ یہاں آپ نے بطور ثبوت نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ ارکان اسلام کے مصالح اور فوائد و نتائج بیان فرما کر کہا کہ تعلیمات اسلام پر کاربند ہو کر معاملات ہی

میں عبادت کی یہی غرض وغایت حاصل ہوسکتی ہے۔ چناں چہ اسلام تاجر صادق کوشہید قرار دیتا ہے۔ اسلام میں تین لڑکیوں والے باپ کے لئے اگر اس نے اپنے فرائض متعلقہ کماحقۂ ادا کئے ہوں جنت کو لازم کرتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دیگر تمام معاملات کا بھی اسلام میں یہی حال ہے۔ پھر حقوق العباد سے متعلق مورل فلاسفی کی بنا اور نیز یہ بیان کر کے انسان پر اس کی ذات کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ کہا کہ نفس کشی کے معاملہ میں اختیارات ذات کے متعلق قدما سے غلطی ہوئی کیوں کہ انسان کی ذات دراصل دو پہلو رکھتی ہے۔ ایک اس کے اپنے متعلق دوسرے سوسائٹی سے متعلق۔ فرمایا عرب جاہلیت میں قتل اولاد کا جو دستور تھا وہی قدمائے ہنود کا بھی معمول تھا۔ فی الحقیقت انہی اختیارات کے بارہ میں اک بڑی بھاری اصولی غلطی تھی۔ اسلام نے اس غلطی کو "**لاتقتلو اولاد کم**" کا حکم دے کر کس خوبی سے مٹایا۔ پیدائش دختر کے وقت اس زمانہ میں جو افسوس ناک کیفیت ہوتی تھی مسلمانوں میں اس آیت شریفہ کے نزول سے اس کا سدِ باب ہوگیا۔............ سے بروز حشر یہ سوال کیا جائے گا اسے اسلام نے کیسے لطیف اور نتیجہ خیز پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ رومن لا بعض پہلوؤں سے نہایت اہم ہے۔ حتیٰ کہ اس سے اب تک استفادہ کیا جاتا ہے پھر بھی وہ نقصوں سے خالی نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس آرائیں آئین مگر برخلاف ان سب کے اسلام کی تعلیم ہر طرح سے احسن اور عدیم النظیر ہے۔ اسلام نے باوجودیکہ وہ عرب میں پیدا ہوا لیکن عجم، تاتار و ہند وغیرہ کو غلام سے آقا اور رعیت سے بادشاہ بنادیا۔ یہ کس بات کا نتیجہ تھا؟ اسلام کی ان خوبیوں ہی کا جو اس میں اور دیگر مذاہب میں مابہ الامتیاز ہیں۔ غلامان اسلام کی قابل فخر حالت دیکھنا ہوتو محمود وغیرہ شاہان قدیم کی حیرت انگیز شان و شوکت کو دیکھئے۔ دراصل عظمت وشوکت کی روح پھونک دینا خاصۂ اسلام ہے اگر کوئی اس کے اصول پر پورا پورا کاربند ہو۔ پھر ذمی، معاہد، عربی کی تشریح کی اور ذمیوں کے

حقوق بیان فرما کر کہا کہ اسلام نے ہر ایک قسم کے لوگوں سے احسن سلوک برتا۔ پھر وصایائے حضرت فاروق، آپ کے عہد میں رعایا کے حقوق، وصولی جزیہ کی کیفیت، ایک یہودی کا ذکر کہ وہ دریوزہ گری سے جزیہ کی ادائیگی کا تردد کرتا پھرتا تھا، اس پر آپ کی رحمدلی، عدل و داد میں اسلام اور خلفائے راشدین کا بے نظیر شیوہ، متناقض آیات پر خود قرآن کریم کا قولِ فیصل، قتل و اخراج وغیرہ کے متعلق ارشاد ربانی کی حکمت اور انجیل کی ناقص تعلیم، اس پر عمل کا نہ ہونا، چناں چہ مسیحی اقوام کی حالت کا اس پر شاہد ہونا وغیرہ وغیرہ صدہا قیمتی نکات و معلومات بیان فرما کر آپ نے دس بجے اپنا لکچر ختم فرمادیا۔

(صحیفہ لاہور اکتوبر ۱۹۷۱ء۔ ص ۸۶-۹۱)

[۴]

تعلیم وتربیت

انجمن حمایت اسلام لاہور ۱۹۰۹ء کے سالانہ جلسے میں بھی علامہ شبلی نے شرکت کی تھی۔ یہ سالانہ جلسہ ۹/ سے ۱۱/اپریل ۱۹۰۹ء یعنی تین دن تک جاری رہا، علامہ شبلی نے پہلے اجلاس کی صدارت کی اور ایک اجلاس میں خطاب کیا۔ یہ خطبہ جناب حنیف شاہد نے صحیفہ لاہور جنوری ۱۹۷۱ء میں شائع کیا ہے، اسے یہاں درج کیا جاتا ہے۔ یہ تقریر ماہنامہ معارف اگست ۱۹۶۷ء میں بھی شائع ہوئی ہے۔

''صاحب صدور ودیگر حضرات انجمن! آپ لوگوں میں سے شائد بعض صاحبوں کو معلوم ہوگا کہ جیسے ہندوستان میں بعض مصلح یا ریفارمر پیدا ہوئے ہیں، اسی طرح مصر میں بھی ایک نامور مصلح پیدا ہوا جس کا نام (اس وقت یاد نہیں)۔ پرانی طبیعت کے عالم تھے، جبہ وعمامہ پہنتے تھے اور پاؤں میں چپل پہنا کرتے تھے۔ لیکن باوجود اس تقدس اور سادگی کے ایک دفعہ ضرور فرانس یا جرمنی کا سفر کیا کرتے تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ یورپ کیوں جاتے ہیں تو آپ نے جواب دیا کہ یہاں رہ کر بوسیدہ ہو جاتا ہوں اور وہاں جا کر پھر تازہ ہو جاتا ہوں۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ایشیا میں افسردگی چھا جاتی ہے اور یورپ میں تازگی اور جوش پیدا ہو جاتا ہے۔

حضرات! جب سے میں نے اپنے تعلقاتِ ملازمت چھوڑے ہیں اور ندوہ کی خدمت کو مقصد زندگی قرار دیا ہے، مجھے بھی تازگی اور جوش کی حرارت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن میں یورپ تو نہیں جاتا، پنجاب میں سفر کرتا ہوں تاکہ اپنی افسردگی کو تازگی اور جوش سے بدل سکوں۔

ہمارے ملک میں جو سستی اور کاہلی پائی جاتی ہے، وہ یہاں (پنجاب میں) نہیں ہے۔ آپ کا ملک ہمہ تن جنبش اور حرکت میں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ اس کا صحیح استعمال کیوں نہیں کرتے۔ اگر صحیح استعمال کرتے تو آپ ضرور بڑھ جاتے، لیکن وہ اسٹیم اور بھاپ بے کار رہا جاتا ہے۔ میں نے بمبئی کے میمنوں کو دیکھا ہے، کلکتے کے معززین کو دیکھا ہے۔ جن لوگوں نے ہندوستان میں بڑا کام کیا ہے، ان کا درجہ اور اقتدار اس کام کے کرنے کے لئے سخت بڑا معاون و مددگار رہا ہے۔ بمبئی میں ہائی اسکول ہے جو بدرالدین طیب جی کا قائم کردہ ہے اور ان کی ذاتی وجاہت سے یہ کام چل رہا ہے۔ کلکتے میں کوئی مثال موجود نہیں۔ کراچی میں اسلامیہ ہائی اسکول ہے۔ پنجاب میں اسلامیہ کالج ہے جس کی عمارت کچھ سامنے ہے، کچھ بننے والی ہے۔ یہ کن لوگوں نے قائم کیا؟ کیا کسی خطاب یافتہ نے قائم کیا یا لکھ پتی یا کروڑ پتی نے یہ بنایا؟ ہرگز نہیں، باوجود اس کے کہ اس کے قائم کرنے والے نہ تو لکھ پتی اور نہ کروڑ پتی ہیں اور نہ ہی خطاب یافتہ، پھر بھی اس کو شروع کر کے یہاں تک پہنچا دیا گیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں جوش زیادہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ حدیث پڑھتے ہیں یعنی ہمارے علما، کیا وجہ ہے کہ ان میں وہ اخلاق اور عمدہ صفات پیدا نہیں ہوتیں جو اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین میں پائی جاتی تھیں۔ مانا کہ ویسے نہیں ہو سکتے لیکن کچھ تو ہونا چاہیئے۔ خیال کر لیا جاتا ہے کہ ان کی طاقتیں فوق البشر تھیں۔ چڑیا اڑتی ہے، تم کیوں نہیں اڑتے، اس لئے کہ اڑا نہیں جاتا۔ میں بدرالدین حسن علی نہیں

ہوں، ایسا کام نہیں کرسکتا۔ یہ ضرور نہیں کہ بڑے بڑے لوگ ہی بڑے کام کریں، خیال کیا جاوے تو ہر ایک آدمی بڑا کام کرسکتا ہے۔

اس کالج یا انجمن کا نام اس پر منحصر ہے کہ آپ جلسہ کرتے ہیں، چندہ ہوتا ہے جو اس کے بقا کا باعث ہے، مگر یہ کوئی مستقل اور پائدار طریقہ نہیں ہے۔ اگر چہ جب تک اور صحیح طریقہ نہ نکلے، اسی پر چلنا چاہئے۔ آپ کو چاہیے کہ ایک دفعہ کوشش کرکے پندرہ بیس لاکھ روپیہ جمع کریں تا کہ روزانہ کی گداگری سے نجات ہو۔ یہ تو آپ کا مسلک ہے کہ اس طرح کام چل جاتا ہے۔ بلحاظ آپ کی انجمن کے مدرسے کی مقامی حالت کے کہ جو کچھ میں کہتا یا تعلیم انگریزی کے متعلق ہوتا یا آپ کے مدرسے سے ہی اس کا تعلق ہوتا، لیکن میں پاتا ہوں کہ مسلمانوں میں دو گروہ ہو گئے ہیں، ایک علماء اور اس کے پیروؤں کا گروہ، دوسرا انگریزی خوانوں اور ان کے ہم خیالوں کا گروہ۔ ایک گروہ میں دوسرے گروہ کے لوگ کم شریک ہوتے ہیں۔ میں نے اس بنا پر مناسب سمجھا ہے کہ جہاں علما کا مجمع ہو، انگریزی خواں آئیں اور ان کو مولوی صاحب اپنا وعظ سنائیں۔ انگریزی خوانوں کے سامنے ہمارے جیسے مولوی کیوں کر لاویں اور ان سے کچھ سنیں۔ اسلام کے متعلق میں کچھ کہنا چاہتا ہوں جس کے سننے کا انگریزی خوانوں کو کم موقع ملتا ہے۔

آپ اتنا تو ضرور جانتے ہیں کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم دنیا میں تشریف لائے، ایک مذہب اور کتاب پیش کی۔ اس کی نسبت دلیری سے کہا کہ یہ خدا کی دی ہوئی ہے، یہ اس کا وحی اور الہام ہے۔ خدا کے منہ سے جو دعویٰ ہوا:

"الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا."

خدا تعالیٰ فرماتا ہے " آج کے دن میں نے پورا کر دیا دین اور مذہب کو اور تم

پر اپنی نعمت کو کامل کر دیا اور اسلام کے مذہب کو تمہارے لئے پسند اور گوارا کر لیا۔'' غور کرنے کی یہ بات ہے کہ مذہب اسلام کامل ہو گیا۔ اب مذہب میں ترقی کی کوئی گنجائش باقی نہیں۔ دوسری آیت میں پھر ارشاد فرمایا:

''ما کان محمد ابا احد من رجالکم و لا کن رسول اللّٰہ و خاتم النبیین.''

رسول اللہ مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ وہ پیغمبر خاتم الانبیاء ہیں۔ ان کے بعد اور کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس کے وجہ یہ ہے کہ:

> ''انسان کی ترقی کے واسطے اللہ تعالیٰ کے علم میں ایک حد مقرر تھی۔ جوں جوں وہ حد ترقی کے قریب ہوتا گیا تو شریعت، مذہب، قانون، اخلاق بھی ترقی کرتا گیا، یہاں تک کہ جناب محمد رسول اللہ صلعم کے زمانے میں قانون، اخلاق، شریعت مکمل ہوگئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اب کسی اور نبی کے آنے کی ضرورت باقی نہیں اور اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔''

تعجب ہے کہ خداوند تعالیٰ تو فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی نعمت آج تم پر کامل کر دی اور نبوت ختم ہو چکی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اور کوئی نبی نہیں آنے کا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام قسم کے اخلاق حسنہ اور مذہبی اعمال غرضکہ حق اللہ اور حق العباد کو کامل اور اتم تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، لیکن ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان علی العموم ایسی بے پروائی کے ساتھ منہ موڑ کر انگریزی اخلاق اور انگریزی تمدن اور انگریزی وضع کی تقلید کرنا ہی اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ ہر وقت اور ہر آدمی انگریزی تہذیب کو اپنا مقتدا اور امام بناتے ہیں، یہاں تک جب کوئی امر ہو تو تمام صفات حسنہ کا مخزن اسی کو سمجھتے ہیں۔ ہر ایک بات میں مشاہیر یورپ ہی کو بطور نمونہ

اور مثال پیش کرتے ہیں۔ حالاں کہ مسلمانوں کی تاریخ میں ہر قسم اور ہر فن کے ایسے لائق اور بزرگوار گذرے ہیں کہ جو اس دنیا میں آسمانِ شہرت کے سورج بن کر چمکے ہیں۔ ہمیں اپنی تاریخ پر نظر ڈال کر دیکھنا چاہیے کہ اس اسلامی خزانے میں کس قدر بے بہا جواہر اور درخشندہ مثالیں موجود ہیں جن کے مقابل مشاہیر یورپ بالکل ہیچ ہیں۔ یہ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ انگریزی خواں مسلمان تاریخ کے پڑھنے اور سمجھنے کی تکلیف گوارا فرماویں، اور یہ ساری باتیں اس لئے ہیں کہ ہمارے نوجوان اپنی مذہبی کتابوں کی طرف، خصوصاً کتاب اللہ اور حدیث شریف کی طرف قطعاً توجہ نہیں کرتے۔ اگر وہ اسکول کے وقت کا آٹھواں حصہ اس کام کے واسطے بھی مقرر کردیں تو ان کو اسلامی اخلاق اور اسلامی تہذیب کی پوری یہ بات بھی بخوبی معلوم ہوجاوے کہ مستند اہل فن، اہل علم کس قوم میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ عالم، صناع، بہادر، اولوالعزم، قوم کی قومیت کو قائم رکھنے والے اور سیاح کس قوم میں پائے جاتے ہیں۔''

''اس جوش کے قائم رکھنے کا ذمہ اس شخص یا اشخاص کے ہاتھ میں ہے جن کے ہاتھ میں عنانِ انتظام کالج ہے۔ درحقیقت لازم تو یہ ہے کہ طلبا کی تعلیم و تربیت کے لئے ایسے استاذ رکھے جاویں جو نہ صرف حدیث پر چلنے کی ہدایت کریں بلکہ مذہب پر چل کر مثال اور نمونہ بنیں تا کہ اس کالج کے طالب علم نہ صرف تعلیم یافتہ مسلمان ہوں بلکہ سچے اور واقعی مولوی بھی بنیں اور یہ طریق عمل تمام اسلامی درس گاہوں کے لئے قابل تقلید نمونہ بنے تا کہ آئندہ نسلیں دنیاوی ترقی کے ساتھ دینی ترقی بھی کرتی جاویں۔''

[۵]

نصاب فارسی

انگریزی حکومت نے بی.اے. کے نصاب سے فارسی کو خارج کر دیا تھا، علامہ شبلی نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور اپنے موقف کی تائید میں محمڈن اینگلو اورینٹل کانفرنس کے تیرہویں سالانہ اجلاس میں زبردست تقریر کی۔ خود گورنر بنگال سر جان ووڈ برن نے نہایت غور سے ان کی تقریر سنی۔ مسٹر محمد شفیع، مسٹر عبدالرحمٰن اور نواب محسن الملک نے بھی علامہ شبلی کی تائید کی اور بالاتفاق یہ قرارداد منظور ہوئی۔ یہ تقریر خطبات شبلی میں شامل نہیں ہوسکی ہے۔ اسے اقبال احمد مجددی نے ماہنامہ معارف جنوری ۱۹۶۸ء میں شائع کرایا ہے۔ اسے معارف کے شکریہ کے ساتھ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

حضرات! پیشتر اس کے کہ میں باضابطہ اس رزولیوشن کی تائید کروں، میں چاہتا ہوں کہ ان دلائل پر جن کی وجہ سے فارسی الہ آباد یونیورسٹی کے تعلیمی کورس سے خارج کی گئی ہے غور کروں۔ اس قسم کی تجویز کے بانی مسٹر نیسفیلڈ تھے، اور یہ تجویز وقتاً فوقتاً یونیورسٹی سینٹ میں پیش ہوا کی، فارسی کے مخالفین کے دو خاص دلائل ہیں، ایک تو یہ کہ فارسی ایک اختیاری مضمون ہے جس کو طالب علم بجائے مشرقی کلاسیکل (یعنی

عربی یا سنسکرت) کے لے سکتا ہے، جب تک کہ ان زبانوں کے کورس میں تفاوت رہے گا، ہرگز یہ امید نہیں ہوسکتی کہ طلبہ عربی یا سنسکرت کو لیں گے، یا ان زبانوں کے کورس کو فارسی کے آسان کورس پر ترجیح دیں گے، اس رزولیوشن کے لایق پیش کنندہ نے متذکرۂ بالا دلیل کا جواب دیا ہے اور رائے دی ہے کہ وہ تفاوت بالکل رفع ہوسکتا ہے، اگر فارسی کورس اتنا ہی مشکل کر دیا جائے جتنا کہ عربی یا سنسکرت کا کورس ہے، اور اس کے پڑھنے اور یاد کرنے میں طالب علم کو اتنی محنت کرنی پڑے جیسی کہ ان دو زبانوں کے کورس میں کرنی پڑتی ہے، یہ بات کہ ''فارسی کورس کافی طور پر مشکل کیا جاسکتا ہے'' اس کورس سے جو کہ ہم نے حال میں طیار کیا ہے، عملی طور پر ثابت ہوگئی ہے، اور اس میں ناکام طالب علموں کی تعداد اتنی ہی بڑھ گئی ہے جتنی کہ دوسرے مضامین میں ہوتی ہے، یہ بات اس کے مشکل ہونے کی ایک کافی شہادت ہے۔

دوسری دلیل بڑے غور سے دیکھنے کے لائق ہے۔ فارسی کے مخالفین کہتے ہیں کہ یہ کلاسیکل زبان نہیں ہے، اس لئے قوت متخیلہ کو تربیت دینے کی طاقت اس میں نہیں ہے جیسی کہ دیگر زبانوں میں ہے، جو ایسے علم وادب سے پڑھیں جن میں قوت متخیلہ پوری طرح کام میں لائی جاسکتی ہے، اس کے لٹریچر میں علوم وفنون اور حقیقی شاعری نہیں ہے، لٹریچروں میں اس زبان کے لٹریچر کا رتبہ بالکل ادنیٰ ہے، مسٹر ماریسن کی تقریر کے بعد میرے لئے جو کام باقی رہا ہے وہ یہ ہے کہ میں اس دوسری دلیل کو غلط ثابت کروں، ان تمام باتوں کو کہنے کے لئے جو اس بارے میں کہی جاسکتی ہیں، کم سے کم دو گھنٹے کی ضرورت ہوگی، اس لئے اس مختصر وقت میں جو مجھے ملا ہے، اپنے دلائل کو خلاصۃً بیان کروں گا۔ میں پہلے علوم وفنون کی جانچ کروں گا، اور اس بات کو دیکھوں گا کہ آیا وہ علوم وفنون جو زبان عربی (جس کے علم اخلاق کی خوبی کے ہمارے مخالفین خود مقر ہیں) میں پائے جاتے ہیں، وہ زبان فارسی میں موجود ہیں یا نہیں، میں یقین کے

ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علم کی تمام شاخیں جو عربی زبان میں ہیں، فارسی میں بھی موجود ہیں اگر چہ کتابوں کی تعداد میں زبان فارسی عربی کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، معانی و بلاغت کا ایک قابل قدر ذخیرہ زبان فارسی میں ہے۔ فلسفہ اور منطق میں سے ہر ایک کی ایک ایک مکمل تصنیف موجود ہے، درۃ التاج فلسفہ کی ایک عمدہ کتاب ہے، فارسی زبان میں شفاء ابن سینا کا ایک مفید خلاصہ موجود ہے جس کا علم طب پر حاوی ہونا سب تسلیم کرتے ہیں، ابوریحان بیرونی کی تمام تصنیفات فارسی میں ہیں جو اس قدر کارآمد ہیں کہ عربی کے علماء کو بھی بعض اوقات ان کے حوالے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن زبان فارسی میں علم کی ایک شاخ ایسی ہے جو کہ صرف اسی زبان میں پائی جاتی ہے، وہ مسلمانوں کے مشہور زمانوں کی بیش بہا تاریخ ہے، مجھے علم تاریخ کے فوائد بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یونیورسٹی کی تعلیم میں اس علم کا مفید ہونا ایک مسلم امر ہے۔ مشکل سے کوئی مشہور تاریخ عربی زبان میں ایسی ہوگی جو فارسی میں نہ ہو، لیکن چند تاریخی تصنیفات زبان فارسی میں ایسی ہیں جو عربی میں نہیں ہیں، مثلاً شاہنامۂ فردوسی، جو فارس کے زمانۂ سلف کی ایک قابل اعتبار تاریخ ہے، اس حیرت انگیز کتاب کے سچے اور جھوٹے واقعات کو جدا کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ شاہ ضحاک کے خونخوار افعی اور سفید دیو وغیرہ کے قصے محض کتاب کی زینت کے واسطے ہیں جو فردوسی کے زمانے کے اشخاص کے پسند خاطر تھے، لیکن اس کتاب کی اصل تہ سچے واقعات کی ہے جو ان تاریخی معلومات پر جو دیگر ذرائع سے اس قدیم سلطنت کے بارے میں حاصل ہوسکتے ہیں، منطبق ہوجاتے ہیں، اس میں اس زمانے کے شہزادوں کی طرز تعلیم، ان کے حسب ونسب، ان کی کیفیتِ مزاج، ان کی حکومت کے حالات وغیرہ تاریخی ہیں، سر جان ملکم نے جن کو فارس میں عرصہ تک مقیم رہنے کا اتفاق ہوا تھا، اور جنہوں نے بڑی تحقیقات کے بعد اپنی کتاب تصنیف کی ہے، فی الحقیقت ان

معلومات میں جو کہ ہم کو فردوسی کے ذریعہ حاصل ہوئی ہیں کوئی ضروری اضافہ نہیں کیا ہے۔فردوسی کی تصنیف میں باطل مشرقی عقائد کو حذف کرنے کے بعد ایسے واقعات نہ پائے جائیں گے جو ملکم صاحب کی تاریخ سے مغائرت رکھتے ہوں۔شاہنامہ میں ذکر ہے کہ جب کیکاؤس ماژندران گیا تو سحر کے زور سے دن رات میں تبدیل ہو گیا،ملکم اس واقعہ کے متعلق کہتا ہے کہ دوسری شہادت کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دن چندر گرہن تھا، ہیرادوٹس جو یورپ میں ایک مسلم کلاسک ہے، رائج الوقت جانچ کو اس حد تک برداشت نہ کر سکے گا جتنا کہ شاہنامہ،جس کے بیانات غیر حقیقی اور پراز مبالغہ معلوم ہوتے ہیں۔علاوہ اس کے مسلمانوں کی تاریخ کے ایسے دور بھی ہیں جن کے حالات فارسی ہی زبان میں ہیں،خاندان صفاری کے تاریخی حالات جو تیمور لنگ کا ہمعصر تھا،صرف فارسی میں ہیں۔سلطنت مغلیہ کی تمام تاریخیں فارسی میں ہیں، جن کو اگر ہم علاحدہ کر دیں تو ہمارے پاس چھ سو برس کے ملکی اور انتظامی حالات کی واقفیت کا کوئی ذریعہ نہ رہے گا۔

فارسی میں ایک چیز اور بھی ہے جو عربی میں نہیں پائی جاتی اور جو انگریزی کے قبضہ میں بھی سو برس پیشتر تک نہ تھی، وہ بادشاہوں اور شہنشاہوں کی اپنی لکھی ہوئی سوانح عمریاں اور روزنامچے ہیں، میں نے جہانگیر کے عہد حکومت کے حالات کے بارے میں مختلف اشخاص کی بیسیوں تصنیفات دیکھی ہیں،لیکن کسی میں ایسی سچائی اور حقیقت کے ساتھ واقعات کا ذکر نہیں ہے،جیسا کہ تزک جہانگیری میں جو اس کی خود تصنیف ہے اور جس میں تاریخ کو ناول کے رنگ وروپ میں دکھایا گیا ہے،اس طرح سے یہ ظاہر ہے کہ فارسی میں علوم کا بہت بڑا ذخیرہ ہے،اب اس کی رنگینی عبارت دکھانا باقی ہے، میں اس موقعہ پر فارسی لٹریچر کے حصۂ نثر کو الگ رہنے دوں گا اور اس کے نظم کے حصوں کی جانچ کروں گا، کہتے ہیں کہ فارسی نظموں میں وہ آزادی کی روح نہیں ہے

جوعربی زبان میں بہ تخصیص حاصل ہے، یہ سچ ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان ایک جنگلی اور خانہ بدوش قوم کے چال چلن کو منعکس کرتی ہے جو ریگستان میں آزادی سے زندگی بسر کرتی ہے اور کسی کے تابعِ حکومت نہیں ہے، لیکن فارسی شاعری میں جس کی بنیاداور ترقی بادشاہوں کے عہد حکومت میں ہوئی قدرتی طور پر ماتحتی اور چاپلوسی کی روح ہے، اس نقص کے علاوہ فارسی شاعری عربی شاعری کا نہایت عمدگی سے مقابلہ کرسکتی ہے اور بعض حالتوں میں اس سے بڑھ سکتی ہے، ہم یورپین علماء کے بہت مشکور ہیں کہ انہوں نے ہم کو ایک نہایت عمدہ میدان فارسی کی تحقیقات کا بتلا دیا ہے جو قوت متخیلہ کو کافی ورزش دے سکتا ہے، وہ فارسی کے علم لسان کا علاقہ، سنسکرت اور یورپین زبانوں کے ساتھ جو آریہ قوم کی زبان سے تعلق رکھتی ہیں دریافت کرنے کا ہے، جرمن پروفیسروں کی اس مضمون پر بہت سی تصنیفات ہیں، اور جس کا آغاز اس ملک میں سخندان پارس کی تصنیف سے ہوا ہے، جو کہ ہمارے اردو لٹریچر کے عالی دماغ ہیرو پروفیسر محمد حسین آزاد کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔

(ماہنامہ معارف جنوری ۱۹۶۸ء)

[۶]

الاسلام (۱)

(مذہب انسان کی فطرت میں شامل ہے)

علامہ شبلی انجمن حمایت اسلام لاہور کے متعدد اجلاسوں میں شریک ہوئے اور تقریریں کیں۔ ۱۸۹۵ء میں اس کا پہلا اجلاس ہوا جس میں سرسید احمد خاں اور ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے ساتھ علامہ شبلی نے بھی شرکت کی تھی، اور ایک جلسہ سے خطاب بھی کیا تھا مگر وہ خطبہ دستیاب نہیں۔ حنیف شاہد نے علامہ شبلی کے حوالہ سے انجمن کی روداد کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ انہیں ۱۹۰۳ء کے اجلاس کا خطبہ کسی روداد میں ملا تھا جسے انہوں نے صحیفہ لاہور جنوری ۱۹۷۱ء میں شائع کیا ہے۔ ذیل میں اسے نقل کیا جاتا ہے۔

یہ خطبہ تحریری تھا مگر علامہ شبلی نے تحریری خطبے کے بعد زبانی خطبہ دیا، نقل نویسوں نے یہ خیال کر کے کہ خطبہ تحریری ہے آخر کا خطبہ نقل نہیں کیا جو کہ بقول مرتب روداد خطبے کی جان تھا، البتہ انہوں نے اس کا خلاصہ درج روداد کیا ہے جو درج ذیل ہے:

’’دنیا اصل میں تین چیزوں کا نام ہے؛ مال، اولاد، مقبولیت و

نیک نامی اور تینوں کی جدا جدا تعریف کر کے قرآن شریف کی آیات سے ثابت کیا تھا کہ جائز طریقے سے ہر ایک کا حاصل کرنا عین دین داری ہے۔ ایک نہایت عمدہ بات یہ بیان کی تھی کہ تمام مذاہب دین و دنیا کو الگ الگ سمجھتے ہیں اس لئے دونوں میں سے ایک پر توجہ کرنے میں خواہ مخواہ دوسرے کا پلہ دب جاتا ہے۔ اسلام نے بتایا کہ دنیا اگر اچھی طرح برتی جاوے تو عین دین ہے۔ یہ بھی بتایا تھا کہ اسلام پر چلنے والوں کو دنیا کی تمام نعمتیں مل جاتی ہیں۔ ثبوت میں صحابہ اور ان لوگوں کے تاریخی حالات بیان کئے تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ یہ بھی بیان کیا تھا کہ اسلام نے غلاموں کو بادشاہ بنایا اور ان غلاموں کے تاریخانہ (کذا) حالات بیان کئے جو بادشاہ، وزیر اور سپہ سالار فوج گزرے ہیں۔''

انسان اور حیوان کا مقابلہ کرو۔ حیوان اپنی تمام ضروریات کا سامان اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ان کا لباس ان کے ساتھ ہوتا ہے جو موسم کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے۔ دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے پنجہ، ناخن، ڈنک کے ہتھیار کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ جن غذاؤں پر اس کی زندگی کا مدار ہے، پیدا ہونے کے ساتھ اس کو ہر طرف جنگل ہو یا پہاڑ، خشکی ہو یا دریا، ویرانہ ہو یا آباد ہر جگہ مہیا ملتی ہیں۔

انسان کا یہ حال ہے کہ جب پیدا ہوتا ہے تو کسی قسم کا سامان اس کے پاس نہیں ہوتا۔ اس کی جلد نازک ہوتی ہے ہاتھ پاؤں کمزور ہوتے ہیں۔ جسم پر کوئی لباس نہیں ہوتا۔ دشمن سے حفاظت کے لئے سینگ یا پنجے نہیں ہوتے۔ اس کے ساتھ جتنی چیزیں اس کے گرد و پیش ہوتی ہیں سب کی سب اس کی دشمن نظر آتی ہیں۔ آفتاب کی گرمی، بادلوں [بارشوں] کی جھڑی، لوؤں کی لپٹ، جاڑوں کی ٹھنڈ ہر چیز چاہتی ہے

کہ اس کو تباہ کر دے۔ خُلِقَ الْاِ نسَانُ ضَعِیْفاً.

ان مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے قدرت نے اس کو کوئی مادی ہتھیار نہیں دیا، کیوں کہ جن بے شمار اور پرزور دشمنوں کا اس کو سامنا کرنا تھا، اس کے لئے کوئی مادی آلہ کافی نہیں ہوسکتا تھا۔ قدرت نے اس کو مادی ہتھیاروں کے بدلے ایک ایسی عام قوت عطا کی جس نے ہر مخالف کے مقابلے کا جدا سامان تیار کیا۔ دھوپ، گرمی، جاڑے سے محفوظ رہنے کے لئے ہر قسم کے لباس اور مکانات بنائے، جانوروں کے مقابلے کے لئے تیغ و خنجر تیار کئے۔ دریاؤں پر پل باندھے، پہاڑ تراشے، لوہا پگھلایا، برق کو مسخر کیا، ہوا کو تھاما۔ غرض تھوڑے عرصے کے بعد دیکھا تو تمام کائنات اس کے پنجۂ اقتدار میں تھی۔ اس عام قوت کا نام عقل کلّی یا عقل انسانی ہے۔ لیکن چونکہ قدرت کو منظور تھا کہ انسان کی ترقیاں بلند سے بلند نقطے پر بھی پہنچ کر ٹھہرنے نہ پائیں اس لئے وہ (یعنی قدرت) اک دم بھی انسان کو چین نہیں لینے دیتی۔ وہ اس کے مخالفوں کو نئے نئے ہتھیار دیتی جاتی ہے، جس سے انسان پر نئی نئی طرح سے حملے کئے جاتے ہیں۔ جن بیماریوں کا علاج معلوم ہو چکا تھا ان کے علاوہ نئے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا کا جغرافیہ جس قدر دریافت ہو چکا ہے اس کے علاوہ نئی آبادیوں کا پتا لگتا ہے اور وہاں نئی ضروریات پیش آتی ہیں۔ آرام و آسائش کے جو سامان مہیا ہو چکے تھے، راحت طلبی کا مادہ بڑھ کر وہ سامان بے کار ہو جاتے ہیں۔ مجبوراً انسان ان نئے مخالفوں کے مقابلے کے لئے نئی تیاریاں کرتا ہے اور ترقی کی جس حد تک پہنچ چکا تھا اس سے آگے نکل جاتا ہے۔

عالم کائنات اور انسان کی یہ باہمی کشمکش اور دار و گیر ہی وہ چیز ہے جو انسان کی تمام ترقیوں کی جڑ ہے اور جس کی بدولت آج سیکڑوں ہزاروں نئے نئے ایجادات کا سلسلہ قائم ہے اور روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن ان بیرونی دشمنوں اور مخالفوں سے

زیادہ سخت اور زیادہ خطرناک دشمنوں کا ایک اور گروہ ہے جو خود انسان کے اندر موجود ہے اور جن سے اس کو ہمیشہ سخت معرکہ آرائیاں رہتی ہیں۔ طمع آمادہ کرتی ہے کہ عزیز و بیگانہ، دوست و دشمن، دور و نزدیک کی تمام دولت و مال پر قبضہ کرلیا جاوے۔ کنبہ پروری کا تقاضا ہے کہ مخالفوں کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاوے۔ غرور چاہتا ہے کہ جب تک تمام عالم کی گردنیں جھک نہ جائیں آرام نہ لے۔ عیش پرستی چاہتی ہے کہ دنیا کی کوئی ناجائز لذت باقی نہ رہ جاوے۔ ان دشمنوں سے بچانے کے لئے ایک حد تک عقل کام آتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اگر تم کسی کی آبرو کا قصد کرو گے تو وہ بھی کرے گا، تم کسی کو برباد کرنا چاہو گے تو وہ بھی چاہے گا۔ تم دوسروں کی عزت نہ کرو گے تو وہ بھی نہ کریں گے۔ لیکن اولاً اس قسم کی پیش بیں اور انجام اندیش عقل خاص خاص تعلیم یافتہ اشخاص کی ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے موقعے پیش آتے ہیں جہاں اس قسم کے انتقام کا مطلق اندیشہ نہیں ہوتا۔ حکومت کا خوف، جاسوس کا ڈر، بدنامی کا احتمال، انتقام ایک چیز بھی نہیں ہوتی۔ ان موقعوں پر عقل ان پرزور مخالفوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی بلکہ ایک دوسری قوت ہے جو سینہ سپر ہوتی ہے اور انسان کو ان دشمنوں کے حملے سے بچاتی ہے۔ اس قوت کا نام ''نور ایمان''، کانشنس''، ''حاسۂ اخلاقی'' ہے اور وہی مذہب کی بنیاد ہے۔

یہ قوت انسان کی اصل فطرت میں داخل ہے۔ عالم و جاہل، رذیل و شریف، شاہ و گدا، افریقہ کا حبشی اور یورپ کا تعلیم یافتہ سب اس میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ یہی معنی ہیں قرآن کی اس آیت کے:

''فَاقِمْ وَجْهَکَ لِلدِّیْنَ حَنِیْفاً فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرِ النَّاس عَلَیْهَا لَا تَبْدِیلَ لَخَلْقِ اللّٰهِ ذَلِکَ الدِّیْنُ الْقِیمُ وَلٰکِین اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُونَ.''

اپنا منہ دین حنیف کی طرف کر، یہ ہی اللہ کی فطرت ہے اور آدمیوں کو اسی

فطرت سے پیدا کیا ہے، اور خدا کے پیدا کرنے میں تبدیلی نہیں ہوتی اور یہ ہی دین مضبوط ہے مگر آدمی نہیں سمجھتے۔

جرمنی کا ایک حکیم گسلر لکھتا ہے:

''مذہب ابدی چیز ہے کیونکہ مذہب جس حاسے کا نتیجہ ہے وہ کسی زمانے میں کبھی معدوم نہیں ہوسکتا۔''

فرانس کا مشہور فاضل معلم رینان اپنی کتاب ''تاریخ مذہب'' میں لکھتا ہے:

''یہ ممکن ہے کہ کل وہ اشیا، جن کو ہم محبوب رکھتے ہیں اور کل وہ چیزیں جو لذائذ زندگی میں محبوب ہیں، مٹ جائیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ مذہب دنیا سے معدوم ہوجائے یا اس کی قوت میں زوال آجائے۔ وہ ہمیشہ اس بات کا علانیہ ثبوت دے گا کہ مادی مذہب (میٹریالزم) بالکل غلط ہے جو یہ چاہتا ہے کہ انسان کی دماغی قوت اس پست خاکی زندگی تک محدود رہ جائے۔''(۲)

پروفیسر سبۃ ''فلسفۂ دینیہ'' میں لکھتا ہے:

''میں کیوں پابند مذہب ہوں؟ اس لئے کہ اس کے خلاف نہیں ہوسکتا کیونکہ پابند مذہب ہونا میری ذاتیات میں ہے۔ لوگ کہیں گے کہ یہ وراثت یا تربیت یا مزاج کا اثر ہے۔ میں نے خود اپنی رائے پر بھی اعتراض کیا ہے لیکن میں نے دیکھا کہ سوال پھر پیدا ہوتا ہے اور حل نہیں ہوتا۔ مذہب کی ضرورت جس قدر مجھ کو اپنی زندگی کے لئے ہے اس سے زیادہ عام انسانی سوسائٹی کو ہے۔''

''مذہب کی شاخ و برگ ہزاروں دفعہ کاٹ ڈالے گئے ہیں لیکن جڑ ہمیشہ قائم رہی ہے اور اس نے نئے برگ و بار پیدا کر لئے

ہیں۔اس بنا پر مذہب ابدی چیز ہے جو کبھی زائل نہیں ہوسکتی۔ مذہب کا
چشمہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے اور فلسفیانہ فکر اور زندگی کے دردناک
تجربے اس کو اور زیادہ گہرا کرتے ہیں۔ انسانیت کی زندگی مذہب ہی
سے قائم ہوئی ہے اور اسی سے قوت پائے گی۔''(۳)

مذہب کے فطری ہونے کی ایک دوسری دلیل یہ ہے کہ دنیا میں افرادِ انسانی کے خاص خاص مختصات یعنی زبان،قوم، ملک،صورت، رنگ کو حذف کرتے جاؤ تو جو چیزیں قدر مشترک رہ جائیں گی ان میں ایک مذہب ہوگا۔جن چیزوں کو ہم انسان کی فطرت خیال کرتے ہیں مثلاً اولاد کی محبت، انتقام کی خواہش، کمال کی قدردانی وغیر وغیرہ، ان کے فطری ہونے کی یہی وجہ قرار دیتے ہیں کہ تمام دنیا کے آدمیوں میں مشترک پائی جاتی ہیں۔اس بنا پر جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر قوم، ہر طبقہ، ہر نسل کوئی نہ کوئی مذہب رکھتا ہے تو یہ مسئلہ صاف ثابت ہوجاتا ہے کہ مذہب فطری چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب کے مقدم اصول تمام مذاہب میں یکساں پائے جاتے ہیں۔ خدا کا وجود، اس کی پرستش کا خیال، حیات بعد الموت، اعمال کی جزا و سزا، رحم دلی، ہمدردی، عفت کو اچھا سمجھنا، جھوٹ، دغا، زنا، چوری کو برا جاننا دنیا کے تمام مذہبوں کا اصل اصول ہے۔

فطرت نے افرادِ انسانی میں بے انتہا فرق مراتب رکھا ہے۔ دولت و مال، جاہ وحشم، فضل وکمال، ذہن وذکا کے عطا کرنے میں ایک طرف تو یہ فیاضی ہے کہ اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی؛ سکندر و تیمور، ارسطو، افلاطون، ہومر، فردوسی اسی فیاضی کے نمونے ہیں۔

دوسری طرف یہ بخل ہے کہ انسان اور بندر میں اتنا فرق رہ جاتا ہے کہ ڈارون کو نظر نہیں آتا۔ بایں ہمہ جو باتیں شرط زندگی اور مدار حیات ہیں، وہ تمام افراد

انسانی کو یکساں عطا کی ہیں۔ افریقہ کا جاہل سے جاہل وحشی بھی اسی طرح کھاتا پیتا، چلتا پھرتا، سوتا جاگتا، بولتا چالتا ہے جس طرح یونان کا بڑے سے بڑا حکیم ان ضروریات کو انجام دیتا ہے۔

اسی سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کا اس قدر حصہ، جو تمام دنیا کی قوموں میں مشترک ہے، لازمۂ انسانی تھا اور اس وجہ سے قدرت نے تمام قوموں کو یکساں عطا کیا۔ ارسطو اور بنتھم بہت سے دلائل کے بعد اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ سچائی، دیانت داری، عفت، علم اچھی چیز ہیں لیکن افریقہ کا ایک وحشی بغیر کسی تعلیم اور بغیر کسی دلیل کے خود بخود ان چیزوں کو اچھا جانتا اور سمجھتا ہے۔

مذہبِ اسلام

یہ تو ثابت ہو چکا کہ مذہب فطری چیز ہے، یعنی جس طرح انسان میں ہمدردی، محبت اور انتقام کے قدرتی جذبات پائے جاتے ہیں، اسی طرح میلان مذہب بھی قدرتی اور فطری ہے اور جس طرح اور قدرتی جذبات کسی شخص میں کم، کسی میں زیادہ، کسی میں بہ ضعف، کسی میں بہ شدت، اور شاذ و نادر افراد میں بالکل نہیں پائے جاتے، بعینہ مذہب کا یہی حال ہے۔ لیکن چونکہ (جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں) حاسۂ مذہبی اس بنا پر انسان کو عطا کیا گیا ہے کہ بغیر اس کے نوع انسانی کا بقا ممکن نہ تھا اس لئے مذہب کا اس قدر حصہ تمام انسانوں میں یکساں مشترک ہے، وہ نہایت سادہ مجمل اور ناتمام ہے، اور ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ اس کی صاف اور صریح تمثیل یہ ہے کہ انسان کے زندہ رہنے کے لئے کھانا پینا، گرمی سردی سے بچنا ضروری ہے، اس لئے قدرت نے ان ضروریات کا سامان ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے لئے بھی مہیا کیا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ سامان اعلیٰ درجے کے بھی ہوں۔ کھانے کے لئے سد رمق، رہنے

کے لئے پھونس کا جھونپڑا، لباس کے لئے درختوں کے پتے بھی مہیا ہو گئے تو قدرت کا فرض ادا ہو گیا۔ مختلف قسم کے الوانِ نعمت، عالی شان محل، بیش بہا ملبوسات، سب کے لئے مہیا ہونا ضرور نہیں۔ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْض.

یہی حال مذہب کا ہے۔ خدا کا وجود، عبادت کی فرضیت، معاد کا خیال، جزا و سزا کا یقین، نبوت کا اعتراف لازمۂ انسانی ہیں اس لئے سب فرقوں میں مشترک ہوگا اور اس میں کسی قوم اور کسی فرقے کی تخصیص نہیں، لیکن یہ امور کہ خدا کے کیا اوصاف ہیں؟ کس قسم کی عبادت فرض ہے؟ کیوں فرض ہے؟ معاد کی کیا حقیقت ہے؟ جزا و سزا سے کیا غرض ہے؟ نبوت کے کیا معنی ہیں؟ ان سوالات کا جس مذہب میں جس قدر صحت، باریک بینی اور حقیقت سنجی سے جواب ملے گا، اسی قدر وہ مذہب کامل اور اعلیٰ تر ہوگا۔ یورپ میں منکرینِ مذاہب کا جو گروہ پیدا ہو گیا ہے اور روز بروز بڑھتا جاتا ہے، ان کے انکارِ مذہب کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ کسی مذہب میں سوالات مذکورہ بالا کا جواب صحیح اور مکمل نہیں پاتے۔ پروفیسر لاردس مذہب کی مخالفت اس بنا پر کرتے ہیں:

> ''اگر ہم کہتے ہیں کہ ان باتوں کا اعتقاد کرنا چاہئے جو عقل میں آئیں تو ہم سے کہا جاتا ہے نہیں، ہرگز نہیں۔ پھر عقل کو جو نیک و بد کی تمیز ہے ذلیل کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں اس قدر اندھی کر دی جاتی ہیں کہ خرق عادت ایک معمولی بات بن جاتی ہے۔ سفید سیاہ ہو جاتا ہے، بدنما چیز خوش نما ہو جاتی ہے تو مذہب آتا ہے اور کہتا ہے کہ ''گردن ڈال دو'' کس کے آگے؟ عقل کے آگے؟ نہیں فطری فرائض کے آگے؟ نہیں احساسات اندرونی کے آگے؟ نہیں۔ اصولِ فطرت کے آگے؟ نہیں!'' (۴)

مانسیو کان ستان نے جو فرانس کا مشہور عالم ہے، مذہب کی حقیقت اور

مذہب کے نشو ونما پر ایک کتاب لکھی ہے۔اس میں وہ مذہب کے نقصانات کی تفصیل بیان کر کے لکھتا ہے کہ:

''مذہب جن بنیادوں پر قائم ہوا ہے، وہ علم کے مخالف ہیں اوراس لئے یہ قطعی ہے کہ تمام مذاہب برباد ہو جائیں۔''(۵)

برتلو لکھتا ہے:

''علم نے اپنی پوری آزادی حاصل کر لی ہے اوراس بات کا خوف نہیں رہا کہ مذہب اس کو دبالے۔''

ان تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان منکرینِ مذاہب کے نزدیک چونکہ مذہبی اصول، عقل، تمدن اور تحقیقات علمی کے مخالف ہیں اس لئے وہ صحیح نہیں ہو سکتے، ورنہ اگر کوئی مذہب ایسا ہو جس کے تمام اصول عقل کے موافق ہوں تو ان مفکرین کو بھی اس کے تسلیم سے انکار نہیں۔اسی بنا پر یورپ کے بڑے بڑے محققین نے مذہب کا ایک خاکہ کھینچا ہے اوراس کا نام ''دیانۃ طبیعیہ'' رکھا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ مذاہب موجود بالکل غلط ہیں۔لیکن اگر ایک نیا مذہب ایجاد کیا جاوے جس کے اصول حسب ذیل قرار دیے جاویں تو وہ بے شبہہ تسلیم کے قابل ہوگا اور تحقیقات علمی کا ساتھ دے سکے گا(۶):

۱۔مذہب کے تمام معتقدات اور مسائل عقل کے موافق ہوں۔کوئی چیز تقلیداً نہ منوائی جائے۔

۲۔عبادت مقصود بالذات نہ ہوں بلکہ ان کا نفع خود بنی نوع انسان کو پہنچے۔

۳۔ دین و دنیا کا رشتہ ایسا قائم کیا جاوے کہ ایک دوسرے کو صدمہ نہ پہنچائے، بلکہ ایک دوسرے کا معاون ہو۔

اب ہم کو ان تینوں اصول کے معیار کے موافق مذہبِ اسلام کو جانچنا چاہیے۔

عقل اور مذہب

سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ تمام مذاہب میں عقل کو کیا درجہ دیا گیا ہے اور اسلام نے عقل کی کیا منزلت قائم کی ہے۔

> ''دنیا میں آج جس قدر مذہب موجود ہیں ان سب میں تلقین کی ابتدا اس حکم سے شروع ہوتی ہے کہ مذہب میں عقل کو دخل نہ دو۔''

یہی جابرانہ حکم ہے جس کی بدولت مذہب ہر قسم کی تحقیقات ، تجربہ اور اجتہادات سے مطمئن رہتا ہے اور ان میں سے کوئی چیز اس کی جباری کو کم نہیں کرسکتی۔ اسی کا اثر ہے کہ ایک شخص منطق ،فلسفہ، ریاضیات میں سیکڑوں عجیب وغریب ایجادات کرتا ہے اور ارسطو و افلاطون کی تحقیقات کو غلط ثابت کرتا ہے، تاہم جب اس کے سامنے کسی غلط مذہبی مسئلے کا ذکر آتا ہے تو اس کی نقادی اور نکتہ سنجی بالکل بے کار ہوجاتی ہے۔اسی کا اثر ہے کہ سقراط اتنا بڑا فلسفی ہوکر جان دینے کے وقت وصیت کرتا ہے کہ فلاں بت پر میں نے نذر چڑھانے کی جو منت مانی تھی وہ پوری کی جاوے۔اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام مذاہب میں سیکڑوں حکما وعلما پیدا ہوتے ہیں لیکن مذہب کے لغو سے لغو عقیدے کی نسبت بھی ان کو شک نہیں پیدا ہوتا۔عقل کی اس بے کاری سے صرف یہ نقصان نہیں پہنچتا ہے کہ جو لغو عقیدہ ایک دفعہ قائم کرلیا گیا تھا وہ اپنے حال پر قائم رہتا ہے بلکہ توہمات اور عجائب پرستی کو روز بروز زیادہ بار ملتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ چند روز کے بعد مذہب کے سچے اور صحیح عقائد بھی ان توہمات کے ہجوم میں چھپ جاتے ہیں اور مذہب ہمہ تن عجائبات اور ناممکنات کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ یہی چیز ہے جس نے یورپ کے آزاد خیالوں کو مذہب سے متنفر بنادیا ہے۔ پروفیسر لاردس نے تمام مذاہب کے برباد ہوجانے کی جو پیش گوئی کی ہے، اسی بنا پر کی ہے کہ ''مذہب عقل کو برباد کرنا

چاہتا ہے اس لئے ضرور ہے کہ خود برباد ہوجائے۔'' یہی پروفیسر ایک مقام پر لکھتا ہے کہ ''اگر ہم بغیر خود غرضی اور وہم پرستی کے اس بات کا پتا لگائیں کہ دنیا میں آج جس قدر مادی، دماغی اور اخلاقی ترقیاں ہوئی ہیں ان کا اصلی سبب کیا ہے تو صرف یہ جواب ہے کہ عقل کا مذہبی شکنجے سے نجات پانا۔'' (۷)

اب دیکھو اسلام کی تلقین کیا ہے؟ قرآن مجید نے یہودیوں، عیسائیوں، بت پرستوں اور ملحدوں کو سیکڑوں جگہ مختلف طریقوں سے عقائد اسلام کی دعوت دی ہے لیکن ایک جگہ بھی یہ نہیں کہا کہ تقلیداً ان عقائد کو مان لو بلکہ ہر جگہ اور ہر موقع پر اجتہاد اور غور کے ذریعے سے ان کو منوانا چاہا ہے اور تقلید پرستی کی سخت برائی کی ہے۔ مخالفین اسلام کی سب سے بڑی غلطی جو ظاہر کی ہے یہ ہے:

''وَ كَايِّن مِنْ آيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْن.'' (یوسف)

اور بہتیری نشانیاں آسمان اور زمین میں ہیں جس میں ہو نکلتے ہیں اور ان پر دھیان نہیں کرتے۔

''لَهُم قَلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْن بِهَا.'' (سورۂ اعراف)

اور ان کے دل ایسے ہیں کہ وہ اس کو نہیں سمجھتے۔

''اِنَّا وَجَدْنَا آبَائَنَا عَلٰى اُمَّةٍ وَ اِنَّ عَلٰى آثَارِهِمْ مُقْتَدُوْن.'' (پارہ ۲۵)

ہم نے جس طریقے پر پائے اپنے باپ دادے اور ہم انہیں کے قدموں پر ہیں۔

''بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَ نَا
وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ.
اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرآنَ.

قُلِ انْظُرُوْا مَا فِی السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ.‘‘

بلکہ ہم اپنے آبا واجداد کے قدم بقدم چلتے ہیں۔بعض آدمی بغیر علم کے اللہ کے متعلق جھگڑا کرتے ہیں۔ کیا اس پر غور نہیں کرتے قرآن مجید میں؟ کہہ دو محمد (ﷺ) دیکھو تم اس چیز کو جو درمیان آسمان اور زمین کے ہے۔کیا نہیں دیکھا انہوں نے آسمان اور زمین میں؟

’’سَنُرِیْھِمْ آیَاتِنَا فِی الْاَفَاقِ وَ فِیْ اَنْفُسِھِمْ.‘‘

قریب ہے کہ دکھلاویں گے ہم ان کو اپنی نشانیاں عالم میں اور ان کے دلوں میں۔

نفس مذہب کی ضرورت اس طرح ظاہر کی۔

’’اَقِمْ وَجْھَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفاً فِطْرَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیھَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلَقِ اللّٰہِ.‘‘

قائم ہو سیدھے دین پر۔اللہ کی فطرت وہ ہے کہ قائم ہیں لوگ اس پر۔اللہ کی فطرت میں تبدیلی نہیں۔

اسلام کی دعوت کا حکم دیا تو اس کے یہ طریقے بتائے:

’’ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبّکَ بِالْحِکْمَۃِ والْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِ لْھُمْ بِالَّتِی ھِیَ اَحْسَنُ.‘‘

بلا تو اپنے رب کے راستے کی طرف اچھی اور عمدہ نصیحتوں سے اور تو ان سے تقریر کر اچھے طریقے سے۔

خاص خاص عقائدِ اسلامی جہاں بیان کئے، ہر ایک عقیدے کے ساتھ اس کی عقلی دلیل بیان کی۔خدا کے ثبوت کے دلائل تو اس کثرت سے قرآن میں مذکور ہیں کہ اس لیکچر میں اس کا احاطہ نہیں ہوسکتا۔خدا کی وحدانیت کو اس طرح ثابت کیا:

" لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰه لَفَسَدَتَا."

اگر ہوتے ان میں کئی معبود سوا اللہ کے، یقیناً ان میں خرابی پڑ جاتی۔

خدا کے عالم ہونے کی یہ دلیل بیان کی:

"اَفَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ."

کیا پس نہیں جانتا اس کو جس نے پیدا کیا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر جو استعجاب تھا، اس طرح رفع کیا:

"قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعاً مِنَ الرُّسُلِ."

کہہ دو اے محمدؐ! نہیں ہوں میں نیا رسولوں میں سے۔

آنحضرتؐ کی نبوت کو اس طرح ثابت کیا:

"يُعَلِّمُهُم الْكِتَابَ و الْحِكْمَةَ."

سکھائی اس نے ان کو کتاب اور حکمت۔

معاد کے ممکن ہونے کا اس طرح یقین دلایا:

"قُلْ يُحْيِهَا الَّذِىْ اَنْشَاءَ هَا اَوَّلَ مَرَّةٍ

أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَادِرٍ عَلٰى اَنْ يُحْيِى الْمَوْتٰى

اَوَلَيْسَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقَادِرٍ عَلٰى اَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ"

کہہ دو اے محمدؐ! وہی ذات زندہ کرتی ہے مردوں کو جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ مردوں کو زندہ کرے؟ کیا وہ ذات قادر نہیں آسمان اور زمین کے مثل پیدا کرنے پر؟

معاد کی ضرورت اس طرح ثابت کی:

"اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنَا كُمْ عَبَثاً وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ."

کیاتم گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو پیدا کیا بیکار؟ اور تحقیق تم ہماری طرف نہ لوٹو گے؟

غرض خواہ نفس، مذہب، خواہ بالخصوص مذہب اسلام، خواہ خاص خاص اسلامی عقائد، جس چیز پر یقین دلانا چاہا، ساتھ ہی دلیل بھی بیان کی۔ ایک جگہ نہیں کہا کہ ان عقائد کو بلا دلیل تسلیم کرو۔

دین و دنیا یا جسمانیات اور روحانیات کا باہمی تعلق اور اس کا موازنہ

مذہب کے نقص و کمال، صحت و غلطی، خوبی و عیب کا سب سے بڑا معیار دین و دنیا یا جسم و روح کے تعلقات کا موازنہ ہے۔ ابتدائے عالم سے اسلام تک بلکہ اسلام مستثنیٰ کر دیا جاوے تو تمام عالم میں آج بھی جس قدر مذہب ہیں، سب نے اس بات میں یک طرف فیصلہ کیا ہے۔

فرقہ اباحیہ (۸) اور مزدکیہ (۹) صرف دنیاوی لذائذ کے قائل ہیں۔ باقی مذاہب نے دنیا کی تمام تمتعات کو ہیچ بتایا اور جس نسبت سے انسان دنیاوی حظوظ سے کنارہ کش رہے، اسی نسبت سے اس کے کمال کے درجے قائم کئے۔ اسی خیال نے دنیا میں جوگی، تارک الدنیا، راہب، منک (۱۰)، ننز (۱۱) پیدا کئے اور ان فرقوں کی وہ عزت دلوں میں قائم کی کہ بڑے سے بڑے شہنشاہ کا سر ایک ذلیل بوریا نشین کے آگے جھک جاتا ہے۔ دنیا کو بالکل ذلیل و ہیچ کہنا اور اپنی تمام رغبتوں اور خواہشوں کو قتل کر دینا مذہب کا اصلی عنصر بن گیا ہے۔

فو یرباش لکھتا ہے کہ مذہب کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ ملکی اور سیاسی زندگی تباہ کر دی جائے اور دنیا کے تمام کاروبار لغو سمجھ کر اس غرض سے چھوڑ دئے جائیں کہ نہایت خضوع کے ساتھ بہشت کے انتظار میں گھلا جائے اور یہ کہ ہر قسم کی

فطری وطبعی جذبات اورخواہشیں قتل کردی جائیں۔(۱۲)

لاردس لکھتا ہے: ''زاہدوں کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ فطرتی خواہشوں کا جواثر ان پر ہے اس کو بالکل مٹادیں۔''(۱۳) مذہب کی تخصیص نہیں، فلسفہ وحکمت کا میلان بھی ہمیشہ اسی طرف رہا ہے۔ سقراط، افلاطون، دیوجانس کلبی، ابونصر فارابی (۱۴) جوگیوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ خوب غور سے دیکھو؛ یہ خیال تمام دنیا پر کس قدر چھا گیا ہے۔ ہم جب کسی شخص کی نسبت سنتے ہیں کہ دنیا اس کی نظر میں ہیچ ہے، فرش خاک پر پڑ رہتا ہے، نان ونمک پر بسر کرتا ہے تو خودبخود ہمارے دل میں اس کی وقعت پیدا ہوتی ہے اور ہم اس بات کی تلاش تک نہیں کر سکتے کہ ان باتوں کے سوا ان میں کمال بھی ہے یا نہیں۔ یہ اسی دنیا کی بے قدری کا اثر ہے جو تمام مذاہب میں پھیلا ہوا ہے اور جس میں ہم مسلمان بھی آلودہ ہو جاتے ہیں۔

دین ودنیا کا موازنہ اور دونوں کے تناسب کو ٹھیک ٹھیک قائم رکھنا اس قدر مشکل ہے کہ یورپ کے بڑے بڑے فلاسفر ایک ناممکن الحصول مقصد کی طرح اس پر حسرت ظاہر کرتے ہیں۔ ہنری برالجیہ ''رویو آف رویوز'' جلد۲۴ میں لکھتا ہے:

> ''آہ! کاش کوئی ذہین شخص مذہبی اور علمی تعصب دونوں نقاب کوایک ساتھ چاک کرڈالتا اوراس مضبوط تعلق کو، جو مذہبی خیال اور علمی تفکر میں ہے، کھول کر دکھا دیتا۔ ایسا کرنے سے جو رنج دہ کشمکش ان دونوں میں ایک مدت سے چلی آتی ہے، وہ مٹ جاتی۔ اگر کوئی شخص ایسا کر سکے تو آج کا نیا زمانہ کیسی دھوم دھام اور کس جوش سے اس کے استقبال کے لئے تیار ہوتا۔''

اب دیکھو اسلام نے دونوں کا کیوں کر موازنہ کیا؟ سب سے پہلے جوگی پن اور ترک دنیا کے خیال کو مٹایا:

”وَ رَهْبَانِيَّةَ اِبْتَدَعُوْها مَا كَتَبْنَا هَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا.“

اور ایک دنیا چھوڑنا انہوں نے نیا نکالیا۔ ہم نے ان پر نہ لکھا تھا مگر چاہئے کو رضامندی اللہ کی، پھر نہ نباہا اس کو جیسا نباہنا چاہیے۔

”وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا.“

نہ بھلا تو اپنے حصے کو دنیا سے۔

”يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبَاتِ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ.“

اے ایمان والو! اللہ نے جن چیزوں کو حلال کیا ہے تم حرام نہ کرو اور حد سے نہ بڑھو۔ اللہ نہیں پسند کرتا زیادتی کرنے والوں کو۔

”قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِى اَخْرَجَ لِعِبَادِه.“

تو کہہ، کس نے منع کی ہے زینت اللہ کی جو پیدا کی اس نے اپنے بندوں کے واسطے۔

”وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ
كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا
فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ
لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَهَا
يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسَر
يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُخَفَّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفاً
يُرِيْدُ اللّٰهُ اَيجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ.“

اور عمدہ چیز کھانے کی کھاؤ اور پیو اور مت اڑاؤ۔ پس گھومو تم زمین میں اور

تلاش کرو خدا کا فضل۔ اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ نہیں دیتا۔ اللہ تم سے آسانی چاہتا ہے کیوں کہ پیدا کیا گیا ہے انسان کو کمزور۔ اللہ نہیں چاہتا تم پر مشکل۔

پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ بتایا کہ دنیا کی ہر قسم کی جائز ناز و نعمت، جاہ و حشمت، لذیذ مشروبات و ماکولات مسلمانوں کا حصہ ہیں۔

"قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ والطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِیَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَة."

تو کہہ کس نے منع کی ہے زینت اللہ کی جو پیدا کی اس نے اپنے بندوں کے واسطے اور عمدہ چیزیں کھانے کی۔ کہہ تو وہی طیبات ان لوگوں کے واسطے ہیں جو پوری طور پر قیامت پر ایمان لائے۔

تمام دیگر مذاہب کی یہ تلقین ہے کہ اس وسیع دنیا سے انسان کا حصہ سدّ رمق کھانا اور دو گز کپڑا ہے۔ لیکن اسلام یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے، زمین، دشت، کوہ، دریا، درخت، چار پائے، لعل و جواہر، فواکہ و روائح سب انسان کے لئے ہے اور اس لئے ہے کہ انسان سب پر قابو چلائے اور سب سے تمتع اٹھائے اور جائز طور پر لطف اٹھائے۔

"اَلَمْ تَرَوْ اَنّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ."

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِيْعاً مِنْهُ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً ." (لقمان)

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ والنَّهَارَ وَالشَّمْسَ والْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِاَمْرِهٖ. (نحل)

کیا نہیں دیکھا تم نے تحقیق اللہ نے تابع کیا تمہارے ان چیزوں کو جو کہ آسمان و زمین میں ہیں۔ اور تابع کیا ہے تمہارے ان سب چیزوں کو جو زمین اور

آسمان میں ہیں۔

اورتم پر پورا کیا اپنی نعمت ظاہرہ و باطنہ کو اور تابع کیا تمہارے رات اور دن، آفتاب، چاند اور ستارے اپنے حکم سے۔

"اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰه سَخَّرَ لَکُمْ مَا فِی الْاَرْضِ

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ البَحْرَ لِتَا کُلُوْا مِنْهُ لَحماً طَرِیاً وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا."

کیا نہیں دیکھا تم نے تحقیق اللہ نے تابع کیا تمہارے ان چیزوں کو جو کہ زمین میں ہیں اور وہ ایسی ذات ہے کہ تابع کیا اس نے دریا کو تا کہ کھاؤ تم اس سے گوشت تازہ اور نکالو تم ان سے زیورات پہننے کے لئے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجاً وَّ جَعَلَ لَکُمْ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ بَنِیْنَ وَّ حَفَدَةَ وَّ رَزَقَکُمْ مِنَ الطَّیِّبَاتِ ط وَ مِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِیْلِ وَالاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْن مِنْهُ سُکَرً وَّ رِزقاً حَسَناً."

"وَّ مَاذَ رَأَیکُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفاً اَلْوَانُهٗ وَالاَنْعَامُ خَلَقَهَا لَکُمْ فِیْهَا دِفْ ءٌ وَمَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاکُلُوْنَ وَلَکُمْ فِیْهَا جَمَالٌ حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ وَ حِیْنَ تُسْرِحُوْنَ." (نحل)

وَالْخَیْلَ والْبِغَالَ والْحَمِیْرَ لِتَرْکَبُوْاهَا وَ زِیْنَةً ط یُنْبِتُ لَکُمْ بِهِ الذَّرْعَ وَالزَّیْتُوْنَ وَالنَّخِیْلَ وَالْاَعْنَابَ وَ مِنْ کُلّ الثَمراتِ ط"

"وَجَعَلَ لَکُمْ مِنَ الْفُلْکِ وَالاَنْعَامِ مَا تَرْکَبُوْنَ لِتَسْتَوُوْ عَلٰی ظُهُوْرِهٖ."

اللہ نے تمہیں میں سے تمہارا جوڑا پیدا کیا اور دئے تم کو تمہاری عورتیں سے بیٹے، پوتے۔ اور کھانے کو دیں ستھری چیزیں۔ اور پھلوں میں سے کھجور اور انگور ہیں کہ

بناتے ہوتم ان سے تشلی اور کھانے کی چیزیں۔اور جو بکھیرا ہے تمہارے واسطے زمین میں کئی رنگ کا اور چوپائے بنا دیے،تم کو ان میں جڑاول ہے اور کئی فائدے ہیں جن میں سے بعضوں کو کھاتے ہو اور تم کو ان سے رونق ہے۔ جب شام کو پھیرلاتے ہو اور جب چراتے ہو اور گھوڑے بنائے؛ خچر اور گدھے تاکہ ان پر سوار ہو اور رونق۔ اگاتا ہے اس سے تمہارے واسطے کھیتی، زیتون، کھجور، انگور اور ہر قسم کے میوے۔ اور بنائی تمہارے واسطے کشتی اور چوپائے تاکہ سوار ہوتم ان پر۔

"**ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا سْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ و تَقُولُوْا سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَرَلَنَا هَذا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ.**

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلَالاً طَيِّباً وَاشْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ اِنْ كُنتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْن."

پھر یاد کرو تم اپنے رب کو جس وقت کہ ان پر سوار ہو اور کہو تم پاک ہے وہ ذات کہ تابع کیا اس نے ہماری ان چیزوں کو اور نہ تھے ہم اس کے قابل۔

پس کھاؤ تم جو کچھ اللہ نے حلال پاک رزق عطا کیا ہے اور شکر ادا کرو اللہ کی نعمتوں کا اگر تم عبادت کرتے ہو۔"

حواشی

(۱) روئداد انجمن، ص۵ تا ۱۷

(۲) یہ دونوں قول تطبیق الدیانۃ الاسلامیہ، ص۲۴و۲۵ میں مذکور ہیں۔

(۳) الحیوۃ حال۔ اول، ص۱۵۵

(۴) ماخوذ از تطبیق، ص۲۴

(۵) تطبیق، ص۲۲

(۶) تطبیق، ص۳۰

(۷) تطبیق، ص۴۳

(۸) ہر چیز کی اباحت کا قائل فرقہ

(۹) مزدک نام ایک شخص کیقباد بدر نوشیرواں شاہ ایران کے زمانے میں مذہبِ اباحت کا بانی گذرا ہے۔ جب نوشیرواں تختِ ایران پر متمکن ہوا تو اس نے مزدک کو مع رفیقوں کے قتل کرا دیا۔ مزدک نے جو مذہب نکالا تھا اس کا سب سے بڑا اصول یہ تھا کہ تمام ملک کی عورتیں اور کل قوم کا مال ایک دوسرے کو اپنے صرف میں لانا جائز ہے۔ دبستان المذاہب میں اس کا حال تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

(۱۰) انگریزی لفظ ہے تارک الدنیا

(۱۱) پہلا لفظ ذکور کے واسطے اور یہ اناث کے واسطے بولا جاتا ہے۔

(۱۲) تطبیق، ص۲۳

(۱۳) تطبیق، ص۵۴

(۱۴) 'فاراب' نواح ترکستان میں آنروے دریائے سیحوں ایک شہر ہے۔ معلم ثانی شیخ ابونصر فارابی یہیں پیدا ہوئے۔ 'فاراب' اور شہر ہے سوائے 'فاریاب' کے جو بار باب کا معرب ہے اور خراسان میں واقع ہے۔ ظہیر فاریابی کا جو ایک نہایت مشہور شاعر ہے، وطن ہے۔

[۷]

علم کلام

فروری ۱۹۰۱ء میں علامہ شبلی نے حیدرآباد کا سفر کیا۔ ۱۵/مارچ ۱۹۰۱ء کو باغ عامہ حیدرآباد میں علم کلام کے موضوع پر ہزاروں کے مجمع سے خطاب کیا۔ اس جلسہ کی صدارت وزیر عدالت مملکت حیدرآباد نے کی۔ یہ خطبہ خطبات شبلی میں شامل نہیں ہے۔ اسے بھی اقبال مجددی لاہور نے ماہنامہ معارف اکتوبر ۱۹۶۹ء میں شائع کرایا ہے۔ اس پر انہوں نے متعدد حواشی لکھے تھے اسے جوں کا توں شامل کرلیا گیا ہے۔

سب سے پہلے میں نہایت ادب کے ساتھ عالی جناب صدر انجمن (۱) صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس جلسہ میں قدم رنجہ فرما کر میری عزت افزائی فرمائی اور پھر ان سب صاحبوں کا جو تکلیف کر کے یہاں تشریف لائے ہیں۔

حضرات آج کا میرا خطبہ (لکچر) علم کلام پر ہے یعنی یہ کہ علم کلام کس علم کا نام ہے؟ وہ کب پیدا ہوا؟ کیونکر پیدا ہوا؟ اس سے کیا نتائج پیدا ہوئے؟

علم کلام کا ترجمہ انگریزی میں ''اسلام اینڈ سائنس'' کیا جاتا ہے۔ فرنچ تصنیفات میں اس کے لئے ''اسکولاسٹیک'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، لیکن درحقیقت یہ الفاظ علم کلام کا مفہوم نہیں ادا کرتے۔

علم کلام کی تعریف

علم کلام کے معنی یہ ہیں کہ مذہب کے عقائد و مسائل کو دلائل عقلیہ سے ثابت کیا جائے۔

علم کلام کی دو قسمیں ہیں

علم کلام کی دو قسمیں ہیں، ایک اندرونی یعنی جو اختلافات باہم مسلمانوں کے پیدا ہو گئے اور ان کے متعلق استدلالات اور مباحثات سے مسلمانوں میں بہت سے فرقے قائم ہو گئے تھے، جن کی تعداد تہتر (۷۳) تک پہونچتی ہے مثلاً معتزلہ، قدریہ، جبریہ، وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام مذاہب کے باہمی مناظرات کا نام بھی علم کلام ہے، لیکن میں اس وقت اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔

دوسرا علم کلام وہ ہے جو فلسفہ کے مقابلہ میں قائم ہوا اور اس وقت میری تقریر کا عنوان یہی علم کلام ہے، اس کی تاریخ نہایت دلچسپ ہے اور اس سے عجیب عجیب معلومات حاصل ہوتے ہیں۔

علم کلام کی ابتدا

علم کلام کی ابتدا کی تاریخ یہ ہے کہ جب خلافت بغداد میں منتقل ہوئی تو منصور عباسی نے جو ہارون رشید کا دادا تھا، دنیا کی تمام قوموں کی علوم وفنون کی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کرائیں، اس غرض کے لئے دنیا کے ہر حصہ سے علما اور مترجمین دربارِ خلافت میں جمع کئے اور ان کو نہایت بیش بہا صلے اور انعامات دئے چنانچہ میں نے اپنے ایک رسالہ میں ان واقعات کو بالتفصیل لکھا ہے، اس وقت تفصیلاً بیان کرنے

کا موقع نہیں۔(۲)

جب ان علوم کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا تو اس کے پڑھنے سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں شبہات اور شکوک پیدا ہوئے، یہاں تک کہ مہدی کے زمانہ خلافت میں جو منصور کا بیٹا تھا، بہت سے لوگ ایسے پیدا ہوئے جو مانی کے پیرو ہوں گے، (یہ مجوسیوں کا ایک مشہور پیشوا اور ایک خاص فرقہ کا بانی تھا) چنانچہ حماد، عجرد وغیرہ نے اس مذہب کی حمایت میں کتابیں لکھیں، یہ حالت اس کی مقتضی تھی اور ممکن بھی تھا کہ ان لوگوں کو سزا دی جاتی یا ان کی زبانیں بند کر دی جاتیں' یا ترجمہ کا سلسلہ روک دیا جاتا، لیکن مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ کسی صدمہ سے اسلام کو ضرر نہیں ہوسکتا اور کوئی بادِ صرصر اسلام کو صدمہ نہیں پہونچا سکتی (چیز) اس لئے خلیفہ مہدی نے روک ٹوک کے بجائے حکم دیا کہ اسلام کے اثبات اور دیگر مذاہب کے رد میں کتابیں لکھی جائیں۔ یہ علم کلام کے وجود کا پہلا دن تھا۔

علم کلام کی ابتدا اور اس کی وجہ تسمیہ کے متعلق ابن خلکان وغیرہ کی غلطی

بعض مورخین کا بیان ہے کہ اس سے پہلے علم کلام پیدا ہو چکا تھا، جس کا بانی واصل ابن عطا تھا اور اس کی وجہ تسمیہ یہ بتاتے ہیں کہ ''چونکہ علم کلام کی پہلی بحث کلامِ الٰہی کے متعلق تھی، اس لئے اس کا نام علم کلام رکھا گیا''، لیکن یہ غلطی ہے۔ علم کلام درحقیقت مہدی کے زمانہ میں پیدا ہوا اور جیسا کہ شہرستانی نے ملل ونحل میں لکھا ہے، علم کلام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس علم کو منطق وفلسفہ کا ہم پلہ قرار دیا تھا اور منطق وکلام ہم معنی الفاظ ہیں۔

علم کلام کا سب سے پہلا مصنف

اول شخص جس نے علم کلام پر کتاب لکھی ، ابوالہذیل علاّف تھا۔(۳) علاّف کے معنی ''گھانس بیچنے والا'' ہے۔اس سے آپ خیال کر سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں کوئی پیشہ معیوب نہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے فقہاء ایسے گذرے ہیں جو موچی یا لوہار وغیرہ کا کام کرتے تھے،اسی کا نتیجہ تھا کہ علماء کو امرِ حق کے ظاہر کرنے میں عوام کی کچھ پروانہیں ہوتی تھی کیونکہ ان کا ذریعۂ معاش عوام کی نذر و نیاز پر موقوف نہ تھا۔آج کل کے علماء جو بالکل عوام کی مرضی کو دیکھتے رہتے ہیں۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اگر عوام برگشتہ ہو جائیں تو علماء کے وسائلِ معاش میں فرق آجائے،اس سے آپ یہ بھی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہر طبقہ میں اس زمانہ میں علم تھا، یہاں تک کہ موچی اور لوہار وغیرہ بھی بڑے بڑے اہلِ کمال ہوتے تھے۔افسوس ہے کہ اب حالت برعکس ہے۔

بہرحال ابوالہذیل علاّف پہلا شخص تھا،جس نے علم کلام پر کتاب لکھی،اس نے بہت سے مناظرات کئے اور ان کا یہ اثر ہوا کہ تین ہزار آدمی اس کی زورِ تقریر سے مسلمان ہو گئے،نہ کہ تلوار سے یا خوف سے یا دباؤ سے۔(چیرز)

ایک مجوسی میلاس نامی بہت سے مجوسیوں کو ساتھ لیکر آیا اور کئی دن تک ابوالہذیل سے مناظرہ رہا۔انجام کار اس نے اپنے سب ساتھیوں کے ساتھ قبول اسلام کیا۔(۴)(چیرز)

نظام

دوسرا شخص نظام تھا جس نے اس علم کو بہت ترقی دی۔چونکہ اس علم کی تکمیل

کے لئے فلسفہ وعقلیات سے نہایت اعلیٰ درجہ کی واقفیت درکار تھی، اس لئے نظام نے یونانی فلسفہ میں نہایت مہارت حاصل کی، یہاں تک کہ جب ایک مرتبہ اس نے ایک برمکی سے کہا کہ آج کل میں ارسطو کی کتاب "الطبایع" کا رد لکھ رہا ہوں اس نے کہا ارسطو کی کتاب تم نے دیکھی بھی نہ ہوگی، ردّ کیا لکھو گے، تو نظام نے جواب دیا کہ آپ کیا چاہتے ہیں "میں آپ کے سامنے اس کتاب کے اول سے آخر تک پڑھ جاؤں یا آخر سے اول تک۔" (۵)

ہارون الرشید نے علم کلام کی تصنیفات کو روک دیا

مہدی کے زمانہ میں یہ حالت رہی، مگر ہارون رشید نے جو یورپ میں الف لیلہ کی وجہ سے بہت مشہور ہے، حکم دیا کہ کوئی شخص علم کلام پر کچھ نہ لکھنے پائے، اس وجہ سے اس قسم کی تصنیفات بالکل بند ہو گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر قوموں نے طعنے دینے شروع کئے کہ اسلام دلائل اور براہین سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ مامون الرشید کے زمانہ تک یہ بدنامی عام ہو چکی تھی۔

مامون الرشید کا علم کلام کو دوبارہ زندہ کرنا

چنانچہ اس کے رفع کرنے کے لئے مامون الرشید نے حکم دیا کہ ایک عام مجلس مناظرہ قائم کی جائے، جس میں تمام دنیا کے پیشوایانِ مذہب بلائے جائیں، اور ہر شخص کو بحث و گفتگو کی عام اجازت دی جائے۔ اس زمانہ میں مجوسیوں کا پیشوائے مذہب یزداں بخت تھا، چنانچہ وہ رے سے طلب ہو کر آیا، اس کے سوا اور تمام پیشوایانِ مذہب ہر جگہ سے طلب کئے گئے اور مسلمانوں کی طرف سے بحث کرنے کے لئے نظام انتخاب کیا گیا، اس معرکہ میں میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ (۶)

علم کلام سے مسلمانوں کی بے تعصبی کا اندازہ

علم کلام کی تاریخ میں سب سے زیادہ جو چیز قابلِ خیال ہے وہ مسلمانوں کی بے تعصبی اور فراخ حوصلگی ہے، جو کتابیں غیر مذہب والوں نے اسلام کے خلاف لکھی ہیں، میرا خیال ہے کہ آج اگر وہ موجود ہوں تو جلا دی جائیں، لیکن اس وقت جبریہ روک ٹوک نہیں کی گئی، بلکہ دلائلِ عقلیہ سے ان کو باطل ثابت کیا گیا جس سے وہ خود ناپید ہوگئیں۔

ایک اور امر حیرت انگیز یہ ہے کہ تاریخوں میں یہ واقعات تو ملتے ہیں کہ مسلمان علماء وفقہاء نے بادشاہان اسلام کے ہاتھ سے تکلیفیں اٹھائیں، مثلاً امام ابوحنیفہؒ وامام مالکؒ وغیرہ نے قیدیں بھگتیں اور تازیانے کھائے لیکن ایک واقعہ بھی ایسا موجود نہیں کہ کسی غیر مذہب کے عالم کو اسلامی حکومت میں کچھ تکلیف پہونچی ہو۔ سلسلۂ بیان میں مجھے ایک بات یاد آ گئی اور خواہی نخواہی کہنا پڑتا ہے کہ میری کتاب الفاروق ؓ جب شائع ہوئی تو مسٹر آرنلڈ نے جو ہمارے کالج کے پروفیسر ہیں اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہا اور لندن میں ''ہیروز''' کے سلسلہ میں داخل کرانے کی تحریک کی، چنانچہ اڈیٹر سے اس معاملہ میں خط وکتابت کی، دو مہینے کے گذرنے پر جواب ملا کہ ایک ایسی کتاب کا چھاپنا جو'' فاروق ؓ'' کے حالات میں ہے،''ہماری پالیسی کے خلاف ہے''۔حالانکہ اڈیٹر نے کتاب مذکور کو آنکھ سے دیکھا تک نہ تھا۔

اس کے مقابلہ میں یہ واقعہ لحاظ کے قابل ہے کہ مامون الرشید کے زمانہ میں یعقوب کندی نے ایک مسلمان رئیس کو اسلام کے متعلق جو خط لکھا اور جس میں نہایت گستاخی سے اسلام پر حملے کئے، مامون الرشید کے سامنے جب وہ خط پیش ہوا تو اس نے صرف یہ کہا کہ مذہبی خیال میں کسی پر جبر نہیں ہوسکتا، **لا اکراہ فی الدّین**. چیز ز

طرہ یہ کہ یورپ والے باوجود اس کے ہم مسلمانوں کو متعصب اور تنگ خیال کہتے ہیں۔

مسلمانوں کی بے تعصبی، روشن ضمیری، فراخ حوصلگی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ انہوں نے غیر قوموں کے علوم وفنون کے ساتھ وہی محبت اور دلچسپی ظاہر کی جو ان کو خود اپنے ذاتی علوم وفنون کے ساتھ تھی۔ وہ یونانی طب کو اپنا علم طب سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ آج ہمارے ہاں کے قدیم حکیموں سے جب کہا جاتا ہے کہ طب یونانی کی بہت سی غلطیاں ثابت ہوئیں تو وہ لڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں، گویا یہ علم خود انہی کا اور ان کے مورثوں کا علم ہے۔

درسِ نظامیہ میں جس قدر کتابیں منطق اور فلسفہ کی شامل ہیں اتنی خاص اسلامی علوم کی نہیں ہیں۔ تفسیر وفقہ کی صرف چند کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، لیکن منطق و فلسفہ کا یہ حال ہے کہ صغری وکبری سے شمسِ بازغہ تک ان کا سلسلہ چلا جاتا ہے۔

مسلمانوں کی بے تعصبی اس قدر بدیہی واقعہ تھا کہ یورپ مشکل سے اس کا انکار کر سکتا تھا، اس لئے یورپ نے بجائے اس کے ایک دوسرا اعتراض قائم کیا اور وہ یہ کہ مسلمانوں نے یونانی فلسفہ کو کچھ ترقی نہیں دی، مسٹر ڈریپر نے لکھا ہے کہ ’’مسلمان درحقیقت ارسطو کی گاڑی کے قلی ہیں۔‘‘

یورپ کے اس اعتراض کا جواب کہ مسلمانوں نے فلسفہ کو کچھ ترقی نہیں دی

افسوس یہ ہے کہ یورپ نے ہمارے علم کلام کی کتابیں نہیں پڑھیں ورنہ وہ دیکھتا کہ ہم ارسطو کے فلسفہ کو ہیچ سمجھتے تھے اور ہم نے دلائل سے اس کو ہیچ ثابت کیا تھا۔ آپ کو سخت حیرت ہوگی کہ منطق جو ایک ایسا یقینی علم ہے جیسے کہ گرائمر اور اس کا رد بظاہر ممکن نہیں۔ مسلمانوں نے نہایت باریک بینی سے اس پر نکتہ چینی کی، علامہ ابن

تیمیہ کی کتاب ''**الرّد علی المنطق**'' جوکئی سوصفحوں میں ہے، آج کل میرے استعما ل میں ہے، میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اگر اس کا ترجمہ یورپ میں شائع کیا جائے تو یورپ کی آنکھیں کھل جائیں۔

فلسفہ کے خلاف مسلمانوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور دو حیثیت سے لکھا ہے۔ اول یہ کہ وہ مسئلہ فلسفہ کی حیثیت سے صحیح ہے یا نہیں، دوسرے یہ کہ مذہب کے مسائل سے مطابق ہے یا نہیں۔ مثلاً فلاسفر کہتے ہیں کہ خدا خود اپنے اختیار سے کوئی فعل نہیں کرتا بلکہ بلا اختیار تمام افعال اس سے سرزد ہوتے رہتے ہیں جس طرح آفتاب سے بلا اختیار روشنی پیدا ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ مسلمانوں کے اعتقاد کے خلاف تھا، اس لئے علم کلام میں اس کو نہایت قوی دلائل سے باطل ثابت کیا گیا۔

اس طرح اور بہت سے عقائد تھے اور ان تمام مسائل میں مسلمانوں نے ارسطو کی غلطیاں ثابت کیں۔ یہ علم کلام کا ایک نہایت مختصر نمونہ اور اس کی تاریخ ہے، اب یہ دیکھنا ہے کہ آج کل ہم کو مذہب کی حفاظت کے لئے علم کلام کی ضرورت ہے یا نہیں اور ہے تو وہی قدیم علم کلام کافی ہے یا ایک دوسرا علم کلام درکار ہے۔

آج کل علم کلام کی ضرورت ہے، یا نہیں؟

میرے خیال میں مسلمانوں کو اپنے مذہب کی حفاظت کے سامان کی آج کل جس قدر ضرورت ہے کبھی کسی زمانہ میں نہ تھی۔ قدیم زمانہ میں اولاً تو تربیت کا ایسا طریقہ تھا جو خود مذہب کی حفاظت کے لئے کافی تھا، ایک مسلمان بچہ جب مکتب میں بیٹھتا تھا تو اس کو اس کا استاد مذہب کی مجسم تصویر نظر آتا تھا۔ بچہ کی ناروا باتوں پر ناجائز، منع، حرام، مکروہ وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے جاتے تھے اور یہ مختصر الفاظ فقہ کے بڑے بڑے مفصل احکام کا کام دیتے تھے، غرض چونکہ ابتدا ہی سے بچے مذہبی قالب

میں ڈھالے جاتے تھے، اس لئے جوان ہوکر وہ بالکل مذہبی بن جاتے تھے۔

اگر شاذ و نادر فلسفہ وغیرہ کے اثر سے مذہب میں تزلزل پیدا ہوتا تھا تو علم کلام کی بے شمار تصنیفات موجود ہوتی تھیں لیکن آج دو باتوں میں سے ایک بھی نہیں۔

تربیت تو اس لئے نہیں کہ اسکولوں اور مدرسوں میں مذہبی پابندی اور مذہبی خیالات کا نام نہیں لیا جاسکتا، جو گورنمنٹ ہم پر حکومت کر رہی ہے، اس کی رعایا میں مختلف مذاہب کے لوگ داخل ہیں اور اس لئے وہ کسی مذہب کی تخصیص نہیں کرسکتی اور درحقیقت اس کو کرنا بھی نہیں چاہئے۔ اسی ضرورت کے لئے مسلمانوں نے علی گڑھ میں اپنا مدرسہ الگ قائم کیا اور اگر یہ ضرورت اس مدرسہ سے انجام پا جائے تو دنیا میں کوئی چیز مسلمانوں کے لئے اس سے زیادہ مفید نہیں ہوسکتی۔

قدیم علم کلام کا آج کل ناکافی ہونا

علم کلام کا یہ حال ہے کہ قدیم علم کلام جو طیار ہوا تھا، وہ فلسفۂ قدیم کے مقابلہ میں تھا، اب سینکڑوں نئے مسائل پیدا ہوگئے جن سے مسلمانوں کے عقائد پر اثر پڑتا ہے اور ان کے دفعیہ کا کوئی سامان نہیں۔ مصر و شام میں بعض علما نے نیا علم کلام مرتب کرنا چاہا، مثلاً حسین جر جس نے حمیدیہ نامی کتاب لکھی۔ ایک اور مصنف نے "**الدّلیل الصّادق**" ایک بڑا رسالہ لکھا، لیکن چونکہ یہ علما یورپ کے علوم سے بالکل ناآشنا ہیں، اس لئے وہ جو کچھ لکھتے ہیں بے سروپا لکھتے ہیں۔

ایک بڑے عالم صاحب نے فرمایا کہ خوردبین میں شیشوں سے جو کچھ نظر آتا ہے اور جس کی بنا پر یورپ والے آسمان وغیرہ سے انکار کرتے ہیں وہ واقعی نہیں ہوتا بلکہ صرف شیشہ کا اثر ہے جس طرح سبز عینک سے تمام چیزیں سبز نظر آتی ہیں اور سرخ سے سرخ۔ آج کل جو لوگ نیا علم کلام مرتب کرنا چاہتے ہیں، ان میں صرف ایک شخص

فرید وجدی بک ہے جو فرنچ زبان کا بڑا ماہر ہے، اس نے اسلام کے ثبوت میں متعدد تصنیفات لکھی ہیں اور نہایت مدلل لکھی ہیں۔ وہ ایک ماہوار رسالہ بھی نکالتا ہے جس میں علم کلام کی بحثیں ہوتی ہیں۔

اس قابل مصنف کے نمونہ پر میں نے ایک نہایت مفصل کتاب لکھنی شروع کی ہے جس کے دو حصے قرار دئے ہیں۔ پہلے حصہ میں قدیم علم کلام کی نہایت مفصل تاریخ اور اس پر ریویو ہے۔ دوسرے حصہ میں جدید علم کلام کے مسائل ہیں۔

اس دوسرے حصہ میں سب سے پہلے یہ ثابت کیا ہے کہ مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے، پھر نہایت تفصیل سے اس پر بحث کی ہے کہ تمام مذاہب موجودہ میں اسلام کو کیا ترجیح حاصل ہے۔ چنانچہ اس موقع پر میں اپنی کتاب کے چند صفحے آپ صاحبوں کے سامنے پڑھتا ہوں۔

مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے

اس نکتہ کے سمجھنے سے پہلے انسان اور حیوان کا مقابلہ کرو۔ حیوان اپنی تمام ضروریات کا سامان اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس کا لباس ان کے ساتھ ہوتا ہے، جو موسموں کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے۔ دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے پنجہ، ناخن، ڈنک کے ہتھیار ان کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، جن غذاؤں پر اس کی زندگی کا مدار ہے۔ پیدا ہونے کے ساتھ اس کو ہر طرف جنگل ہو یا پہاڑ، خشکی ہو یا دریا، ویرانہ ہو یا آبادی ہر جگہ مہیا ملتی ہے۔ انسان کا یہ حال ہے کہ جب پیدا ہوتا ہے تو کسی قسم کا سامان اس کے پاس مہیا نہیں ہوتا، اس کی جلد نازک ہوتی ہے، ہاتھ پاؤں کمزور ہوتے ہیں، جسم پر کوئی لباس نہیں ہوتا، دشمن سے حفاظت کے لئے سینگ یا پنجے نہیں ہوتے۔ اس کے ساتھ عالمِ فطرت کی جتنی چیزیں اس کے گرد و پیش ہوتی ہیں، سب

کی سب اس کی دشمن نظر آتی ہیں۔آفتاب کی گرمی، بادلوں کی جھڑی، لوؤں کی لپٹ، جاڑوں کی ٹھنڈ ہر چیز چاہتی ہے کہ اس کو تباہ کردے۔ یہ معنی ہیں قرآن کی اس آیت کے "**خلق الانسان ضعیفا**".

ان مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے قدرت نے اس کو کوئی مادی ہتھیار نہیں دیا کیونکہ جن بے شمار اور پرزور دشمنوں کو اس کا سامنا کرنا تھا، اس کے لئے کوئی مادی آلہ کافی نہیں ہوسکتا تھا، اس لئے قدرت نے اس کو مادی ہتھیاروں کے بدلے ایک ایسی عام قوت عطا کی جس نے ہر مخالف کے مقابلہ کا جدا سامان تیار کیا، دھوپ، گرمی، جاڑے سے محفوظ رہنے کے لئے ہر قسم کے لباس اور مکانات بنائے، جانوروں کے مقابلہ کے لئے تیغ وخنجر طیار کئے۔ دریاؤں پر پل باندھے۔ پہاڑ تراشے۔ لوہا پگھلایا۔ برق کو مسخر کیا۔ ہوا کو تھاما۔ غرض تھوڑی دیر کے بعد دیکھا تو تمام کائنات اس کے پنجۂ اقتدار میں تھی۔ اس عام قوت کا نام عقل کُلّی یا عقلِ انسانی ہے۔

لیکن چونکہ قدرت کو منظور تھا کہ انسان کی ترقیاں بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچ کر ٹھہرنے نہ پائیں، اس لئے وہ (یعنی قدرت) ایک دم بھی انسان کو چین نہیں لینے دیتی۔ وہ اس کے مخالفوں کو نئے نئے ہتھیار دیتی جاتی ہے، جس سے ہر انسان پر نئے نئے طرح کے حملے کئے جاتے ہیں۔جن بیماریوں کا علاج معلوم ہو چکا تھا ان کے علاوہ نئے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا کا جغرافیہ جس قدر دریافت ہو چکا تھا، اس کے علاوہ نئی آبادیوں کا پتہ لگتا ہے اور وہاں نئی ضروریات پیش آتی ہیں۔آرام و آسایش کے جو سامان ہو چکے تھے، راحت طلبی کا مادہ بڑھ کر وہ سامان بے کار ہو جاتے ہیں۔ مجبوراً انسان ان نئے مخالفوں کے مقابلہ کے لئے نئی طیاریاں (۷) کرتا ہے اور ترقی کی جس حد تک پہنچ چکا تھا اس سے آگے نکل جاتا ہے۔ عالمِ کون اور انسان کی یہی باہمی کشمکش وہ چیز ہے جو انسان کی تمام ترقیوں کی جڑ ہے اور جس کی بدولت آج یورپ

میں سینکڑوں ہزاروں نئے نئے ایجادات کا سلسلہ قائم ہےاورروز بروز بڑھتا جاتا ہے، لیکن ان بیرونی دشمنوں اور مخالفوں سے زیادہ بحث اور زیادہ خطرناک دشمنوں کا ایک گروہ ہے جوخود انسانوں کے اندر موجود ہے، اور جن سے انسان کو ہمیشہ سخت معرکہ آرائیاں رہتی ہیں۔ طمع اس کوآمادہ کرتی ہے کہ عزیز و بیگانہ، دوست و دشمن، دورونزدیک کی تمام دولت و مال پر قبضہ کرلیا جائے۔ کینہ پروری کا تقاضا ہے کہ مخالفوں کا نام صفحۂ ہستی سے مٹادیا جائے۔ جاہ طلبی کہتی ہے جب تک تمام عالم کی گردنیں جھک نہ جائیں آرام نہ لے، ان دشمنوں سے بچانے کے لئے ایک حد تک یہی عقل کام آتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اگر تم کسی کی آبرو کا قصد کروگے ،تو وہ بھی کرے گا، تم کسی کو برباد کرنا چاہوگے تو وہ بھی چاہے گا، تم دوسروں کی عزت نہ کروگے تو وہ بھی نہ کریں گے؟ لیکن اول تو اس قسم کی پیش بیں اور انجام اندیش عقل خاص خاص تعلیم یافتہ اشخاص میں ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے مواقع پیش آتے ہیں جہاں اس قسم کے مساویانہ انتقام کا مطلق اندیشہ نہیں ہوتا۔ حکومت کا خوف، جاسوس کا ڈر، بدنامی کا احتمال، انتقام کا خطرہ، ایک بھی چیز نہیں ہوتی۔ ان موقعوں پر عقل ان پرزور مخالفوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی، بلکہ ایک دوسری قوت ہے جو سینہ سپر ہوتی ہے اور انسان کو ان دشمنوں کے حملہ سے بچاتی ہے اس قوت کا نام نور ایمان، کانشنس، حاسۂ اخلاقی ہے اور یہی مذہب ہے۔

یہ قوت اس کی اصل فطرت میں داخل ہے۔ عالم و جاہل، رزیل وشریف، شاہ و گدا، افریقہ کا وحشی اور یورپ کا تعلیم یافتہ سب اس میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ یہی معنی ہیں قرآن کریم اس کی آیت کے ''**فاقم وجهک للدّین حنیفاً فطرة اللّٰه الّتی فطر الناس علیها، لا تبدیل لخلق اللّٰه ذلک الدّین القیم و لکن اکثر النَّاسَ لا یعلمون.** (۸)

جرمن کا ایک حکیم لکھتا ہے کہ:

''مذہب ابدی چیز ہے، کیونکہ جس حاسہ کا نتیجہ ہے وہ کسی زمانہ میں کبھی معدوم نہیں ہوسکتا۔''

فرانس کا مشہور فاضل معلم رینان اپنی کتاب ''تاریخ مذہب'' میں لکھتا ہے:

''یہ ممکن ہے کہ کل وہ اشیا جن کو ہم محبوب رکھتے ہیں اور کل وہ چیزیں جو لذائذ زندگی میں محبوب ہوسکتی ہیں مٹ جائیں، لیکن یہ ناممکن ہے کہ مذہب دنیا سے معدوم ہوجائے، یا اس کی قوت میں زوال آجائے۔ وہ ہمیشہ اس بات کا اعلانیہ ثبوت دے گا کہ مادی مذہب (میٹریلزم) بالکل غلط ہے، جو یہ چاہتا ہے کہ انسان کی دماغی قوت اس پست خاکی زندگی تک محدود رہ جائے۔''

پروفیسر سیستر ''فلسفۂ دینیہ'' میں لکھتا ہے:

''میں کیوں پابند مذہب نہ ہوں، اس لئے کہ اس کے خلاف میں کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا، کیونکہ پابند مذہب ہونا میری ذاتیات میں ہے۔ لوگ کہیں گے کہ یہ وراثت یا تربیت یا مزاج کا اثر ہے۔ میں نے خود اپنی رائے پر یہی اعتراض کیا ہے، لیکن میں نے دیکھا کہ سوال پھر پیدا ہوتا ہے اور وہ حل نہیں ہوتا؟ مذہب کی ضرورت جس قدر مجھ کو اپنی ذاتی زندگی کے لئے ہے، اس سے زیادہ تمام انسانی سوسائٹی کو ہے، مذہب کی شاخ و برگ ہزاروں دفعہ کاٹ ڈالی گئی ہیں لیکن یہ جڑ ہمیشہ قائم رہی ہے، اور اس نے نئے برگ و بار پیدا کر لئے ہیں، اس بنا پر مذہب ابدی چیز ہے جو کبھی زائل نہیں ہوسکتی، مذہب کا چشمہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے اور فلسفیانہ فکر اور زندگی کے دردناک تجربے اس کو اور زیادہ گہرا کرتے جاتے ہیں، انسانیت کی زندگی مذہب ہی سے قائم

ہوتی ہے اور اسی سے قوت پائے گی۔"

دنیا افرادِ انسانی کی خاص خاص مختصات یعنی زبان، قوم، ملک، صورت، رنگ کو حذف کرتے جاؤ تو جو چیزیں مشترک رہ جائیں گی، ان میں ایک مذہب ہوگا اور یہ اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ مذہب فطری چیز ہے جب چیزوں کی کی ہم انسان کی فطرت خیال کرتے ہیں، مثلاً اولاد کی محبت، انتقام کی خواہش، کمال کی قدردانی، ان کے فطری ہونے کی یہی وجہ قرار دیتے ہیں کہ تمام دنیا کے آدمیوں میں مشترک پائی جاتی ہیں۔ اس بنا پر جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر قوم، ہر طبقہ، ہر نسل، کوئی نہ کوئی مذہب رکھتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مذہب انسان کی فطری چیزوں میں شمار نہ کیا جائے، صرف اسی قدر نہیں بلکہ مذہب کے جو مقدم اصول ہیں، وہ تمام مذاہب میں یکساں پائے جاتے ہیں، خدا کا وجود، اس کی پرستش کا خیال، حیات بعد الموت، اعمال کی جزا وسزا، رحمدلی، ہمدردی، عفت کو اچھا سمجھنا، جھوٹ، دغا، زنا، چوری کو برا جاننا، تمام دنیا کے مذہبوں کا اصل اصول ہے۔

فطرت نے افراد انسانی میں بے انتہا فرق مراتب رکھا ہے، دولت و مال، جاہ وحشم، فضل وکمال، ذہن وذکا کے عطا کرنے میں ایک طرف تو یہ فیاضی ہے کہ اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ سکندر و تیمور، ارسطو و افلاطون، ہومر وفردوسی اسی فیاضی کے نمونے ہیں، دوسری طرف یہ بخل ہے کہ انسان اور بندر میں اتنا کم فرق رہ جاتا ہے کہ ڈارون کو نظر بھی نہیں آتا، بااین ہمہ جو باتیں شرط زندگی اور مدار حیات ہیں وہ تمام افراد انسانی کو یکساں عطا کی ہیں۔ افریقہ کا جاہل وحشی بھی اسی طرح کھاتا، پیتا، چلتا، پھرتا، سوتا، جاگتا، بولتا چالتا ہے جس طرح یونان کا بڑے سے بڑا حکیم ان ضروریات کو انجام دیتا ہے، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کا اس قدر حصہ جو تمام دنیا کی قوموں میں مشترک ہے، لازمۂ انسانی تھا اور اس وجہ سے قدرت نے تمام قوموں

کو یکساں عطا کیا۔ارسطو اور مبتہم بہت سے دلائل کے بعد اس نتیجہ تک پہونچے کہ سچائی، دیانت داری، عفت، حلم، اچھی چیزیں ہیں، لیکن افریقہ کا ایک وحشی بغیر تعلیم اور بغیر کسی دلیل کے خود بخود ان چیزوں کو اچھا جانتا ہے اور اچھا سمجھتا ہے۔

ان تمام باتوں سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ نفس مذہب اور مذہب کے مقدم اصول فطری چیزیں ہیں جو انسان سے جدا نہیں ہوسکتیں اور جو لوگ جس سے الگ ہونا چاہتے ہیں، وہ گویا اصول فطرت کو توڑنا چاہتے ہیں۔

لکچرار نے یہاں پہونچ کر کہا کہ افسوس میں بالکل تھک گیا،
اور اس وجہ سے اس مضمون کا وہ حصہ جس میں خاص مذہب اسلام کی
صحت اور ترجیح کا ذکر ہے نہیں پڑھ سکتا۔

حواشی

(۱) یعنی عالی جناب نواب مشیر الدولہ فخر الملک بہادر وزیر عدالت دام مجدہٗ

(۲) اس رسالہ سے مراد علامہ شبلی کی کتاب ''علم الکلام'' ہے، جو اولاً مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوئی۔ غالبًا ۱۹۰۱ء میں (اس مضمون کو لکھنے کی تاریخ) تک اس کا دوسرا حصہ ''الکلام'' شائع نہیں ہوا ہوگا، اس لئے یہاں حصہ اول کو ''رسالہ'' لکھا گیا ہے۔

(۳) ''ابوالہذیل'' کا پورا نام محمد بن الہذل بن عبداللہ بن مکحول ہے۔ ۱۳۱ھ میں پیدا ہوا اور ۲۳۵ھ میں وفات پائی۔ (ملاحظہ ہو علم الکلام ص ۳۵ طبع آگرہ)

(۴) ابن خلکان تذکرہ ابوالہذیل علاف

(۵) مل و نمل ابن مرتضی زیدی

(۶) اس مناظرہ کا ذکر ابن الندیم نے اجمالاً اور یحیٰی زیدی نے ملل و نحل میں تفصیلاً کیا ہے۔

(۷) تیاراور تیاریاں، اس لکچر میں ہر جگہ ''ت'' کی بجائے ''ط'' سے لکھا گیا ہے، مولانا شبلی مرحوم کی دیگر کتابیں جوان کی زندگی میں شائع ہوئیں، یہ الفاظ اسی طرح چھپے ہیں، نیز اردو کی بعض قدیم کتابوں میں بھی تیار کو طیّار لکھا گیا ہے۔ (محمد اقبال مجدّدی)

(۸) یہ نکتہ تیرہ سو برس کے بعد اب یورپ کے حکما کے خیال میں آیا

(ماہنامہ معارف اکتوبر ۱۹۶۹ء)

باب سوم

دیباچه و تقریظ

[۱]

عربی بول چال

یہ حافظ عبدالرحمٰن امرت سری [۱۸۴۰-۱۹۰۷ء] کی تصنیف ہے، اس پر علامہ شبلی کی تقریظ وکیل امرت سر ۲۷/ اکتوبر ۱۹۰۲ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔

ہندوستان میں اس گروہ کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے جو جدید عربی زبان کے فوائد سے متمتع ہونا چاہتا ہے۔ مصر و شام و بیروت میں عربی رسالے اور اخبارات نہایت کثرت سے شائع ہوئے ہیں جن میں نہایت اعلیٰ درجہ کے علمی اور اخلاقی مضامین اور یجنل اور یورپی زبانوں سے ترجمہ ہوکر شائع ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تمام رسالے اور اخبارات اس جدید عربی زبان میں ہوتے ہیں جس کو ہمارے ملک کے عربی داں بہت کم سمجھتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ جدید عربی زبان میں بہت سے نئے الفاظ اور بہت سے غیر زبانوں کے معرب الفاظ شامل ہوگئے ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ جدید الفاظ و محاورات کی ایک مستقل فرہنگ طیار کی جائے۔

ہمارے دوست حافظ عبدالرحمٰن صاحب نے جو زمانہ کے پورے نبض شناس ہیں، اس ضرورت کا احساس کیا اور عربی بول چال کے نام سے ایک نہایت مفید اور جامع رسالہ لکھا۔ اس رسالہ میں حافظ صاحب نے اول مفردات اور پھر ان کے

استعمال کے طریقے اس خوبی سے لکھے ہیں کہ انسان اس کے ذریعہ سے محاورہ حال کے مطابق عربی میں بخوبی بات چیت کرنے پر قادر ہوسکتا ہے۔ اور چونکہ اکثر الفاظ اور فقرے محاورہ حال کے موافق لکھے ہیں اور ساتھ ساتھ اردو میں ان کے معنی بھی لکھ دئے ہیں، اس لئے عربی اخبارات اور رسالوں کے سمجھنے پر بھی اس کے ذریعہ سے پوری قدرت حاصل ہوسکتی ہے۔

ہم کو امید ہے کہ اہل ملک اس کتاب کو نہایت قدردانی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اس کی قیمت بلامحصول ۸/ر ہے۔

شبلی نعمانی

۱۱/ اکتوبر ۱۹۰۲ء

[۲]

تعلیم

''تعلیم منشی سراج الدین احمد [۱۸٦۷-۱۹۲۵ء] ایڈیٹر سرمور گزٹ (سرمور ناہن) اور چودھویں صدی راول پنڈی کی کتاب ہے جو ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ علامہ شبلی نے اس پر جو تقریظ لکھی تھی وہ چودھویں صدی راولپنڈی میں ۲۳؍ستمبر ۱۸۹۷ء کو شائع ہوئی ہے۔ یاد رہے کہ یہ وہی منشی سراج الدین ہیں جنھوں نے سبقت کی غرض سے سیرۃ الفاروق لکھی تھی جسے سرسید نے سخت ناپسند کیا بلکہ ان کے خلاف اظہار رائے بھی کیا تھا۔''

میں نے رسالہ تعلیم کو غور سے پڑھا، حقیقت یہ ہے کہ وہ جس سوال کا جواب ہے اس میں مسلمانوں کی تخصیص غلط تھی اور اس لئے آپ کی تحریر مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں سے متعلق تھی۔ درحقیقت ہندوستان کا یہ عام حال ہے نہ صرف مسلمانوں کا۔

کتاب نہایت مفید اور دلچسپ ہے اور اس سے آپ کی دقت نظر اور دقیقہ رسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بےشبہ اگر اس کے مطابق عمل کیا جائے تو نہایت مفید نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔ آپ نے ان لوگوں کو مطلع کیا ہے جن پر بہت کم نگاہ پڑتی تھی

کیوں کہ اگر وہ غلطیاں تھیں لیکن بہت باریک غلطیاں تھیں، میں بجز اس بات کے کہ اس کو مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں کہتا اور ہر طرح پر اس کی عمدگی کا معترف ہوں۔

شبلی نعمانی

۵رجنوری ۱۸۹۲ء

---

[۳]

حیات النذیر

منشی سید افتخار عالم آزاد مارہروی اردو کے ادیب، شاعر اور سوانح نگار تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی سوانح عمری حیات النذیر انہوں نے اس طرح لکھی ہے کہ اس کی زبان و بیان پر صاحب سوانح یعنی ڈپٹی نذیر احمد کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اس کتاب پر انہوں نے علامہ شبلی سے تنقید لکھوا کر شامل کی ہے، اب خود حیات النذیر کا شمار نادر کتابوں میں ہوتا ہے۔ اس لئے علامہ شبلی کی یہ تنقید بھی ان کی نادر تحریروں میں شامل ہے۔ اس کے لئے میں ڈاکٹر عطا خورشید صاحب کا ممنون ہوں۔

سید افتخار عالم مارہروی حیات النذیر کے بعد حیات شبلی لکھنے کے آرزومند تھے چنانچہ انہوں نے علامہ شبلی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے منع کیا۔ اس زمانہ میں علامہ شبلی نے مولانا آزاد کو ایک خط لکھا تو اس میں لکھا کہ ''ہاں اور سنیں افتخار عالم صاحب مولوی نذیر احمد کی لائف لکھ کر انہی آلودہ ہاتھوں سے حیات شبلی کو چھونا چاہتے ہیں اجازت اور حالات مانگے ہیں میں نے لکھ دیا ہے کہ ظاہری حالات تو ہر جگہ مل جائیں گے لیکن عالم السرائر خدا کے سوا ایک اور بھی ہے وہاں سے منگوایئے، بھئی بتا تو نہ دوگے ایسے لوگ لاکھ لکھیں تو کس کو خوشی

ہوگی۔''   (مکاتیب شبلی حصہ اول ص ۲۵۱-۲۵۲)

مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے اس خط پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اس فقرہ سے استکبار اور ترفع کا مفہوم نہ سمجھا جائے مقصود یہ ہے کہ منشی صاحب مرحوم صرف اردو و فارسی کا علم رکھتے تھے گو خوش سلیقہ اور سنجیدہ تھے تاہم مولانا پر لکھنے کے لئے علوم عربیہ اور فنون کلامیہ اور ادب و تاریخ پر اطلاع ضروری تھی اس لئے مولانا کا خیال تھا کہ وہ ان کی سوانح عمری کے فرض سے بہ آسانی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔''

(حیات شبلی ص ۳۵)

باوجود اس کے سید افتخار عالم صاحب حیات شبلی لکھنے کے لئے کوشش کرتے رہے اور دوبارہ شبلی سے رابطہ کیا مگر انہوں نے لکھا کہ:

''میری لائف میرے بعد لکھئے گا ورنہ مکمل لائف کیونکر ہوگی۔''

(مکاتیب شبلی اول ص ۳۱۵)

بہرحال وہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود حیات شبلی نہ لکھ سکے۔ ان کی فرمائش پر علامہ شبلی نے حیات النذیر پر جو تنقید لکھی تھی اس سے بھی شبلی کی ان سے عدم ذہنی مناسبت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس تقریظ کے آخر میں حواشی کے عنوان سے منشی افتخار عالم مارہروی نے اعتراضات شبلی کے جو جوابات دیئے ہیں انہیں بھی درج کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

مولانا نذیر احمد مرحوم اس پایہ کے شخص تھے کہ اگر یورپ میں پیدا ہوتے تو ان کی بیسیوں سوانح عمریاں لکھی جاتیں۔ ملک اس ضرورت کو محسوس کر رہا تھا۔ اور مسرت کی بات ہے کہ یہ ضرورت بوجہ احسن پوری ہوئی۔

مصنف نے جس تفحص، استقصا اور سعی و تلاش سے واقعات بہم پہونچائے ہیں وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مصنف نے مولانا نذیر احمد کے لٹریچر کا اس قدر تتبع کیا ہے کہ کتاب پر خود مولانا کے لٹریچر کا دھوکا ہوتا ہے۔

سوانح نگار کا آج کل جو طرز ہے وہ ایک قسم کی وکالت (۱) کے درجے تک پہونچ گیا ہے اور یہ حسن ہے یا عیب۔ لیکن یہ تصنیف بھی اس وصف سے خالی نہیں۔

یہ امر بھی تعجب سے خالی نہیں کہ مصنف نے فسانۂ مبتلا کا انتخاب ضرورت سے زیادہ (۲) کیا ہے۔

مجھ کو اس کتاب کے متعلق اس بات کا نہایت افسوس ہے کہ مصنف نے مولانا اور شاہ ولی اللہ صاحب کا مقابلہ کیا ہے اور وہ اس طرح کہ شاہ صاحب کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا اردو ترجمہ لے کر مولوی نذیر احمد صاحب کی کتاب حقوق و فرائض سے موازنہ کیا ہے۔ یہ ایسی بات ہے کہ کوئی شخص قرآن مجید کے ترجمے سے قرآن مجید کے محاسن کا اندازہ کرے۔ حجۃ اللہ البالغہ (۳) کا اردو ترجمہ ترجمے کی بدتر سے بدتر مثال ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ اس درجے کی کتاب ہے کہ مولانا نذیر احمد مرحوم کے لئے یہ فخر بس کرتا ہے کہ وہ اس کے دقائق اور محاسن کو بخوبی سمجھ سکتے تھے۔

مولانا نذیر احمد کی فارسی نویسی کی جو مثالیں پیش کی ہیں مجھ کو شبہ ہے کہ وہ ان کی فارسی انشاپردازی کی نسبت کس قسم کی شہادت (۴) دے سکیں گے۔

بہرحال ہم مصنف کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ایک فاضل کی قدردانی کا پورا حق ادا کیا اور خدمت انجام دی جو زبان اردو کی طرف سے ایک فرض واجب الادا تھا۔

مصنف نے کتاب کے ڈیڈی کیشن میں بھی حسن انتخاب کی قابلیت ثابت کی ہے۔ جناب صاحب زادے کپتان حاجی محمد حمید اللہ خاں صاحب اے.ڈی.سی. فرزندِ اصغر علیا حضرت فرماں روائے ریاست بھوپال کا علمی ذوق اور علم کی قدر دانی اس کی مستحق ہے کہ علمی تصنیفات ان کے نام سے معنون کی جائیں اس زمانے میں ایسی رؤساء کی مثالیں بہت کم مل سکتی ہیں۔

حواشی

(۱) وکالت کے تو یہ معنی ہیں کہ اپنے موکل کی جا و بے جا طرف داری کی جائے۔ لیکن مؤلف حیات النذیر یقین دلاتا ہے کہ اس کو مولوی نذیر احمد مرحوم کے کل عیبوں پر عبور نہیں ہے۔ اگر عبور ہوتا تو وہ ضرور درج کرتا۔ اس بارے میں جتنا کچھ بھی علم تھا وہ اس کے لکھنے سے باز نہیں رہا۔ یعنی اس نے اپنے زعم میں روشن اور تاریک دونوں رخ دکھادئے ہیں۔ اگر سیکنڈ ایڈیشن کی نوبت آئی اور مولف کو بھی مولانا کی کمزوریاں معلوم ہوگئیں تو وہ درج کرنے میں ہرگز باک نہ کرے گا۔۱۲

(۲) فسانۂ مبتلا کا ضرورت سے زیادہ انتخاب ایک خاص وجہ سے کیا گیا ہے۔ اس نکتے کو ہمارے مکرم مولوی مفتی انوار الحق صاحب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیمات ریاست بھوپال اپنے ریویو میں خوب سمجھے ہیں۔۱۲

(۳) اگر آیات اللہ الکاملہ۔ حجۃ اللہ البالغہ کا اردو ترجمہ۔ ترجمے کی بدتر سے بدتر مثال ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اس کے سوا موازنہ جو کیا گیا ہے وہ اردو لٹریچر کا موازنہ نہیں ہے بلکہ مطالب و معانی و نکات اور موشگافیوں کا موازنہ ہے۔ مجھ کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ مولوی نذیر احمد مرحوم نے جس وقت الحقوق والفرائض لکھنے کا ارادہ کیا تھا اس وقت نہ صرف حضرت امام غزالی کی بعض تصانیف اور حضرت شاہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ ان کے پیش نظر تھی بلکہ اور مصنفین کی

کتابیں بھی مطالعہ کی تھیں کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا نے ان تصانیف سے استفادہ نہیں کیا ہوگا۔ مگر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی حضرت امام غزالی کی تصانیف کو پیش نظر رکھا ہوگا۔ دنیا میں اسی طرح چراغ سے چراغ جلتے چلے آئے ہیں۔ حضرت امام غزالی کے چراغ سے شاہ صاحب نے چراغ جلایا اور شاہ صاحب کے چراغ سے مولوی نذیر احمد نے۔ اور یہ بات مسلم ہے کہ پہلے چراغ سے دوسرے چراغ میں زیادہ روشنی ہوتی ہے۔

ع نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد زاوّل

اگر اسی طرح تیسرے چراغ میں پہلے اور دوسرے سے زیادہ روشنی ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے **فضلنا بعضکم علی بعض** . ہاں اگر حضرت شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں مولانا نذیر احمد کی تصانیف سے زیادہ موشگافیاں فرمائی ہیں اور آیات اللہ الکاملہ اس کا عشر عشیر نہیں تو علامہ شبلی نعمانی سے زیادہ مجھے موازنہ کا افسوس ہے اس لئے کہ اگر کوئی صاحب حجۃ اللہ البالغہ کا صحیح ترجمہ کر کے طبع فرمائیں تو اس جرم کی پاداش میں جو بوجہ استعداد مجھ سے سرزد ہوا ہے بطور کفارہ اپنی بضاعت سے زیادہ پچاس روپیہ امداداً مترجم صاحب کو نذر کروں گا تا کہ لوگوں کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

(۴) مولوی نذیر احمد کی فارسی انشا پردازی کے متعلق اس سے زیادہ زبردست اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ ہماری موجودہ مغلق اور دقیق اور پیچیدہ انشاؤں کے مقابلے میں ان کی فارسی زیادہ سلیس زیادہ فصیح اور زیادہ دلچسپ ہے اگر حیاۃ النذیر کے سکنڈ ایڈیشن کی نوبت آئی تو ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسی بیّن مثالیں پیش کریں گے جن سے کوئی انکار نہیں کر سکے گا۔

[۴]

سفر نامہ ابن بطوطہ

حاجی سید محمد حیات الحسن آنزیری جج گورنمنٹ نظام حیدرآباد نے سفر نامہ ابن بطوطہ کا ترجمہ کیا جسے جنرل لا بک ایجنسی امرت سر نے ۱۹۰۱ء میں شائع کیا، اس میں علامہ شبلی کی تقریظ کا خلاصہ شامل ہے۔ یہ خلاصہ غالباً خود مترجم نے کیا۔

میں نے اس ترجمہ کو چند جگہ سے اصل کے ساتھ ملا کر دیکھا، ترجمہ صحیح ہے اور جہاں تک ہوسکا ہے الفاظ کی رعایت ہاتھ سے جانے نہیں دی ہے۔

بے شبہ یہ کتاب دلچسپ اور مفید ہے اور اس قابل ہے کہ اس کی اشاعت میں کوشش کی جائے۔

شبلی نعمانی

۱۰/اپریل ۱۹۰۱ء

حیدرآباد دکن

---

[۵]

مصباح القواعد

''مصباح القواعد مترجم قرآن مولوی فتح محمد خاں جالندھری [م:۱۹۲۸ء] کی تصنیف ہے۔۱۹۰۴ء میں پہلی بار شائع ہوئی اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔ان دونوں طباعتوں میں علامہ شبلی کی رائے درج ہے۔ یہ کتاب دراصل انجمن ترقی اردو کے منصوبہ تراجم کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔''

انجمن کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اردو زبان کے قواعد پر ایک مکمل اور بسیط کتاب تیار کرائے چنانچہ جلسہ انتظامی منعقدہ ۲۹ر اگست ۱۹۰۳ء میں یہ طے ہوا تھا کہ اس غرض کے لئے شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی اور مولوی حیدر علی صاحب طباطبائی پروفیسر نظام کالج سے درخواست کی جائے۔اسی اثنا میں مولوی فتح محمد خاں صاحب کی ایک کتاب اسی مضمون پر انجمن میں آئی۔ یہ کتاب تمام اور کتابوں کی نسبت نہایت مفصل اور مبسوط لکھی گئی ہے اور مولوی صاحب موصوف نے اس کی ترتیب وتالیف میں ایک مدت صرف کی ہے۔انجمن نے ارادہ کیا ہے کہ اسی کتاب کو اضافہ اور ترمیم اور اصلاح کر کے اپنے مقصد کے موافق درست کرلیا جائے۔ چنانچہ مولوی حیدر علی صاحب موصوف،مولوی عبدالحلیم صاحب شرر،مولوی عبدالغنی صاحب بہاری عہدہ دار نظام اور خود سکریٹری نے نوبت بہ نوبت اس کتاب کو غور اور تعمق کی نظر سے دیکھا اور اکثر جگہ ترمیم اور اصلاح کی۔

---

[۶]

دستور نامہ فارسی

''یہ کتاب مولوی محمد حسین شریف کی تصنیف ہے۔ مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں متعدد اہل علم کی تقاریظ درج ہیں۔ جس میں علامہ شبلی بھی شامل ہیں۔''

میں نے جناب مولوی محمد حسین شریف صاحب کی کتاب دستور نامہ فارسی اکثر جگہ سے بغور دیکھی۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب ایک معرکہ آرا کتاب ہے۔ مصنف نے مشکل اور اہم مسائل کو بڑی بسط اور تنقید سے لکھا ہے۔ بہت سے اصول اور قواعد خود بھی ایجاد کئے ہیں۔ مصنف نے سابق سے جا بہ جا اختلاف بھی کیا ہے اور وہاں بھی زور طبع دکھلایا ہے۔ اس قدر ہے کہ یہ کتاب بوجہ وقت مضامین کے منتہیوں کے قابل ہے۔

تشبیہ کی بحث اس میں استطراداً موضوع سے خارج آ گئی ہے۔ بہر حال یہ کتاب ہر طرح قدر دانی کے مستحق ہے۔

شبلی نعمانی

۱۷ر فروری ۱۹۰۴ء

ناظم علوم وفنون سرکار عالی حیدرآباد دکن

---

[۷]

فطرت الاسلام

''صفی الدولہ حسام الملک شمس العلماء نواب سید محمد علی حسن خاں [م: ۱۹۳۶ء] نواب صدیق حسن خاں کے صاحبزادے اور علامہ شبلی کے حبیب خاص تھے۔ وہ قادر الکلام شاعر اور مصنف ومؤلف تھے۔ ان کے قلم سے متعدد کتابیں نکلی ہیں، ان کی ایک کتاب فطرت الاسلام ہے جس پر علامہ شبلی کے قلم سے تقریظ شامل ہے۔''

ایشیا میں امرا کا مشغلہ ہمیشہ چنگ و نے اور ساغر و مے رہا ہے لیکن چونکہ کوئی کوئی کلیہ استثنا سے خالی نہیں ہے اس لئے خال خال ایسے نفوس بھی پائے جاتے ہیں جو ظاہری دولت مندی کے ساتھ علم وفضل کی دولت سے بھی بہرہ ور ہیں۔ انہی مستثنیات میں ہمارے معزز اور محترم دوست نواب سید محمد علی حسن خاں خلف الرشید نواب امیر الملک صدیق الحسن خاں مرحوم ہیں۔

آج ملک میں ضعیف الاعتقادی کی عام ہوا چل گئی ہے اور منتہی سے مبتدی تک کوئی اس کے اثر سے بچا نہیں۔ ضرورت کے لحاظ سے ارباب نظر نے مختلف کتابیں لکھیں لیکن ان کا طرز بیان ایسا تھا کہ مبتدی اور کم استعداد اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ جناب موصوف الصدر نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور فطرۃ الاسلام نام ایک کتاب لکھی

جواس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ تمام مہمات مسائل کواس انداز سے سوال و جواب کے پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ ایک معمولی سمجھ کا آدمی بخوبی سمجھ لے اوراس کا دل مطمئن ہو جائے۔دلائل اسی درجہ کے برہانی اور یقینی ہیں۔ صرف طرز بیان کا فرق ہے کہ مشکل سے مشکل مسئلہ آسان ہو جاتا ہے۔

ہم کو امید ہے کہ کتاب مقبول ہوگی اور نواب صاحب موصوف کواس قسم کی اور تصنیفات کا حوصلہ دلائے گی۔

شبلی نعمانی

۱۲/اپریل ۱۹۱۰ء

[۸]

The Taj and its Environments

''یہ محمد معین الدین کی کتاب معین الآثار یا تاریخ آگرہ مطبوعہ ۱۹۰۴ء کا انگریزی ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے آخر میں مختلف آراء درج ہیں اس میں علامہ شبلی کی رائے بھی شامل ہے۔ غالباً مترجم نے اسے انگریزی کا جامہ پہنایا ہے۔''

I have gone through the work on the Taj. It is a nice book indeed_based on careful investigation of facts. The language is elegant and clear. I have found it intersting. I hope other will read it with pleasure.

31st May, 1904

---

[۹]

تاریخ النوائط

یہ نواب عزیز جنگ ولا کی تصنیف ہے۔۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔گذشتہ دنوں معارف میں اس پر بڑی بحث وتحقیق رہی۔

قدیم زمانہ میں شخصی سلطنت کے اصول نے فن تاریخ پر یہ اثر کیا تھا کہ تاریخی تصنیفات میں جو کچھ لکھا جاتا تھا صرف سلاطین کے واقعات اور حالات ہوتے تھے۔ملک اور قوم کے حالات سے مطلق بحث نہیں ہوتی تھی۔یہی سبب ہے کہ سیکڑوں ہزاروں تاریخوں کو پڑھ کر اگر پتہ لگانا چاہو کہ اس زمانہ کا تمدن،تہذیب ومعاشرت کیا تھی تو تم کو بالکل ناکامی ہوگی۔لیکن اب مغربی تہذیب کے اثر نے یہ حالت بالکل بدل دی ہے۔آج سب سے زیادہ جس چیز کی تلاش ہے وہ قومی اور ملکی معاملات ہیں اور موجودہ تصنیفات میں خصوصیت کے ساتھ ان ہی باتوں کا لحاظ کیا جاتا ہے۔لیکن یہ انداز صرف زمانۂ حال میں نبھ سکتا ہے کیونکہ قدیم ذخیروں میں یہ سامان بہت کم موجود ہے۔اس لئے آج کتنی ہی کوشش اور کاوش کی جائے پوری کامیابی نہیں ہوسکتی۔ ایسی حالت میں اگر کوئی مصنف غیرمعمولی دیدہ ریزی سے اس قسم کے کچھ واقعات بہم پہونچائے تو بےانتہا قدردانی کا مستحق ہوگا۔ہم جس کتاب پر ریویو کررہے ہیں اسی قسم کی ایک کامیاب تصنیف ہے۔ ابتداء اسلام سے عرب وعجم کے سیکڑوں خاندان

ہندوستان میں آ کر آباد ہوئے، جن کے کارنامے چہرۂ تاریخ کے خدوخال ہیں۔ ان ہی میں نوائط کا خاندان ہے جو آج سے سیکڑوں برس پہلے ہندوستان میں آیا اور بڑی کامیابی کے ساتھ مدراس اور دکن کے حصوں میں پھولا پھلا۔ آج بھی یہ خاندان امتیاز کے ساتھ قائم ہے اور اس کی یادگاریں ان ممالک میں ہر جگہ ایک خاص نام ونمود رکھتی ہیں۔ یہ کتاب اسی خاندان کے حالات میں نواب عزیز جنگ بہادر کی تصنیف ہے۔ اگرچہ نواب صاحب کو اس مرحلہ کے طے کرنے میں بعض قدیم تصنیفات سے مدد ملی ہے، کیونکہ خود اسی خاندان کے مصنف نے ''انساب النوائط'' وغیرہ کے عنوان سے ایک دو کتابیں لکھی ہیں۔ جو اس مرحلہ میں گویا چراغ راہ ہیں۔ لیکن نواب صاحب نے جس قسم کے واقعات اور حالات بہم پہونچائے ہیں اور ان کے لحاظ سے یہ تصنیف گویا اس باب میں پہلی تصنیف ہے۔ کتاب کے دیباچہ میں مضامین کی جو فہرست ہے اس سے بہ آسانی اس دعویٰ کی تصدیق ہوسکتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ایسی تحقیقات کے بہم پہونچانے میں چونکہ ہر قسم کی تصنیفات کا اعتبار کرنا پڑا ہے اس لئے ایک نکتہ چیں کو اعتراض کا موقع ہاتھ آسکتا ہے۔ مثلاً صفحہ ۲۹ر میں محدث طبری کی جو عبارت نقل کی ہے وہ اصل کتاب سے نہیں بلکہ ''گلستان نسب'' اور آزاد بلگرامی کے حوالہ سے ہے۔ اصل کتاب آج چھپ گئی ہے اور اس میں اس عبارت کا ہم کو پتہ نہیں ملتا۔ لیکن اس قسم کے امور میں ایک مصنف اوروں کی رائے کا پابند نہیں ہوسکتا۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ جس شخص نے حوالہ دیا ہے وہ مثبت ہے اس لئے ممکن ہے کہ آپ نے طبری کی چودہ جلدوں میں سے کسی موقع پر یہ عبارت دیکھی ہو۔ جب تک اتنی بڑی کتاب کا لفظ لفظ مطالعہ نہ کیا جائے ایک معتبر ناقل کے حوالہ کو غلط نہیں کہا جاسکتا۔

آج دلی اور لکھنؤ والوں نے زبان کی پابندی کا بڑا شور وغل مچا رکھا ہے۔ تذکیر وتانیث کے متعلق ان نخوت پرستوں کی خاطر ملحوظ رکھنے میں ایک مصنف کو بہت

سی مجبوریاں ہیں جس کی مادری زبان دکھنی ہے۔ کسی دوسری زبان کے محاورہ میں علم کے ذریعہ سے کیسی ہی قابلیت بہم پہونچائی جائے لیکن کسی نہ کسی موقع پر مادری زبان کی جھلک ضرور آجاتی ہے۔ مثلاً نواب صاحب نے یادگار کو کہیں مؤنث لکھا ہے اور کہیں مذکر لیکن دلی اور لکھنؤ والے اس کو عموماً مؤنث لکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں ''فرہنگ آصفیہ'' کی تحقیق نواب صاحب کے لئے کافی ہے۔ اسی قسم کے اور جزئیات بھی ہیں لیکن ایسی چھوٹی باتیں کتاب کی قدر و قیمت کو کم نہیں کرسکتیں۔ ہم بہرحال نواب صاحب کی تحقیقات اور تدقیقات کی داد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ تمام ملک ایسی نادر تصنیف کی قدر کرے گا۔

خاکسار
شبلی نعمانی (شمس العلماء)
ناظم سررشتہ علوم وفنون سرکار نظام و
معتمد انجمن ترقی اردو

[۱۰]

تاریخ تمدن

تاریخ تمدن دراصل ہنری طامس بکل (Henry Thomas Buckle) کی کتاب ہسٹری آف سویلائزیشن ان یورپ (History of Civilisation in Europe) کا اردو ترجمہ ہے۔ اسے اردو کا جامہ منشی احمد علی کاکوروی نے پہنایا، ۱۹۰۹ء میں اس کا پہلا اور ۱۹۱۷ء میں دوسرا ایڈیشن لکھنؤ سے شائع ہوا۔ مترجم کی فرمائش پر علامہ شبلی نے یہ دیباچہ لکھا۔ یہ ترجمہ انجمن ترقی اردو کے منصوبہ کے تحت کیا گیا تھا اور ایک عرصہ بعد ۱۹۳۳ء میں اس کا ایک ایڈیشن انجمن نے شائع کیا۔

جدید تعلیم یافتہ کی نسبت عام شکایت ہے (اور وہ ناراض نہ ہوں تو غالباً صحیح بھی ہے) کہ ان میں علمی مذاق نہیں پایا جاتا۔ ملک میں جس قدر تعلیم یافتہ ہیں، اس مناسبت سے تصنیفات و تالیفات کہاں ہیں؟ لیکن ہر کلیہ میں مستثنیات بھی ہوتے ہیں اور یہ چند ارباب علم ملک میں نظر آتے ہیں انہی مستثنیات کی مثالیں ہیں۔ انہی قابل قدر لوگوں میں ہمارے مرحوم مترجم بھی ہیں جن کی کتاب کا ہم ریویو کر رہے ہیں۔

مرحوم کا نام منشی احمد علی ہے۔ وہ کاکوری کے اس مشہور خاندان کے ممبر ہیں

جس کی تاریخ ابتداء سے آج تک ہمیشہ روشن اور نمایاں رہی ہے۔ انہوں نے بی.اے. تک تعلیم حاصل کی۔ ابتداء ہی سے وہ علمی مذاق رکھتے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے ''صحیفۂ زرین'' کی ترتیب میں شرکت کی۔ علمی مضامین بھی لکھتے رہتے تھے۔ لیکن ایک مستقل اور مشکل علمی خدمت جو انہوں نے اپنے ذمہ لی، وہ بکلز ہسٹری کا ترجمہ تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب میں حیدرآباد میں تھا اور انجمن اردو کا سکریٹری تھا۔ انہوں نے مجھ کو اپنے ارادہ سے اطلاع دی اور چونکہ مجھ کو ان کی قابلیت پر اطمینان تھا، میں نے بہت مسرت سے ان کے ارادے کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے ترجمہ کا معتد بہ حصہ میرے پاس بھیجا اور میں نے اور احباب کی شرکت کے ساتھ اس کا ایک ایک حرف پڑھا اور ان کی اجازت سے کہیں کہیں عبارت میں دخل وتصرف بھی کیا۔

کتاب کا موضوع اس قدر مشکل ہے کہ اس کے مطالب کا اردو میں ادا کرنا نہایت دشوار ہے۔ اسی موضوع پر گیزو کی جو کتاب ہے اور بکل کی کتاب سے آسان ہے، اس کا عربی میں ترجمہ ہوگیا ہے۔ ہم نے اس کتاب کو دیکھا ہے اور ہم کو بے تکلف کہنا چاہیئے کہ ترجمہ کے فن میں ہمارے ہندی دوست نے مصری ترجمہ سے علانیہ بازی جیتی ہے۔

کتاب دو جلدوں میں ہے۔ مرحوم نے پہلی جلد کے سات بابوں میں سے چھ کا ترجمہ کرلیا تھا۔ ان میں سے دو باب کا ترجمہ اس وقت شائع کیا جاتا ہے۔ مرحوم نے کتاب پر ایک نہایت مبسوط مقدمہ لکھا ہے جس سے ان کی قابلیت علمی کا اندازہ ہوسکتا ہے، وہ بھی اس ترجمہ کے ساتھ ہے۔ باقی ابواب میں سے چھ باب کا ترجمہ تو خود مرحوم نے کرلیا تھا، ساتویں باب کا ترجمہ مرحوم کی یادگار میں ان کے بعض اعزہ کررہے ہیں اور یہ سب ایک جداگانہ حصہ کی صورت میں شائع ہوگا، بشرطیکہ پہلے حصہ کے شائع ہوجانے پر اس بات کا ثبوت مل سکے کہ قوم کا علمی مذاق ایسی خشک اور علمی تصنیفات کے

خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہے۔

کتاب کے مصارف طبع کی مشکل، ہمارے آنریبل سر راجہ علی محمد خاں صاحب رئیس محمود آباد نے حل کی ہے جن کی فیاضیاں اس قسم کے کاموں میں ہمیشہ صرف ہوتی رہی ہیں۔

شبلی

۵رمئی ۱۹۰۹ء

لکھنؤ

[۱۱]

خطوط منشی امیر احمد

یہ امیر مینائی کے خطوط کا مجموعہ ہے جسے مولوی احسن اللہ خاں
ثاقب نے مرتب کیا ہے اور جو ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ اس کے پہلے
ایڈیشن کے لئے علامہ شبلی سے ایک تحریر لکھوائی گئی تھی مگر وہ بوجوہ طبع
اول میں شامل نہ ہو کر طبع دوم ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی ہے۔

اردو شاعری کے اخیر تاجدار دو شخص تسلیم کئے گئے ہیں، امیر و داغ۔ امیر، یعنی منشی امیر احمد صاحب مرحوم، شاعری کے علاوہ بہت سے کمالات کے جامع تھے، یعنی اگر وہ شاعر نہ ہوتے تب بھی ایک نامور شخص ہوتے۔ اس بنا پر اور نیز ان کے کمال شاعری کے لحاظ سے ضرور ہے کہ ان کی مفصل اور جامع سوانح عمری لکھی جائے۔ افسوس ہے کہ اب تک کسی نے اس ضروری کام کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ افسوس اس لحاظ سے اور زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ منشی صاحب موصوف کا سلسلۂ تلامذہ نہایت وسیع ہے، جس میں متعدد ایسے حضرات موجود ہیں کہ جو اس فرض کو خوبی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں۔

ہم اپنے معزز دوست مولوی محمد احسن اللہ خاں صاحب ثاقب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے گو سوانح عمری لکھنے کی تکلیف نہیں اٹھائی لیکن اس کے لیے ایک بہت

ضروری مصالحہ مہیا کر دیا۔

سوانح کا بڑا ضروری اور دلچسپ حصہ اس شخص کے روزمرہ کے حالات و مقامات وخیالات ہوتے ہیں۔انسان کے خیالات اور انداز طبیعت کا پتا زیادہ تر اس کی خط و کتابت اور مراسلت سے لگتا ہے۔مولوی صاحب موصوف نے جناب منشی صاحب کے خطوط جا بجا سے بہم پہونچا کر ایک خاص طریقے سے مرتب کیے ہیں۔ جن سے اگر کوئی چاہے تو سوانح عمری کا بہت کچھ سامان حاصل کر سکتا ہے۔

کسی مصنف کے سوانح کا دوسرا ضروری حصہ اس کے کلام کی تقریظ وتنقید ہے۔مولوی صاحب موصوف نے ان خطوط کے دیباچے میں مختصر حالات کے ساتھ کلام پر ناقدانہ ریویو کیا ہے اور اس فرض کو ایسے بے لاگ طریقے سے ادا کیا ہے کہ استادی کے حقوق بھی نظر انداز کر دئے ہیں۔

میری رائے جناب منشی صاحب مرحوم کے کلام کے متعلق ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو،لیکن میں اگر ان کا شاگرد ہوتا تو ایسی بے لاگ، بیدردانہ تنقید نہ کر سکتا۔

منشی صاحب مرحوم کی لپیٹ میں مرزا داغ بھی آ گئے ہیں اور جب ہمارے دوست کو استادی کا حق اظہار حق سے مانع نہ ہوا تو داغ کا کیوں پاس کرتے،اس بنا پر داغ کی کمزوریاں اور غلطیاں دکھائی ہیں اور اس میں اس بات سے مدد لی ہے کہ داغ کا علمی سرمایہ کچھ نہ تھا۔لیکن اہل عرب کا یہ خیال ہے کہ شاعر جس قدر علوم رسمی سے بے بہرہ ہوگا اسی قدر بڑا شاعر ہوگا۔یہی بات ہے کہ شعرائے جاہلیت کی برابری شعرائے اسلام نہیں کر سکتے۔

فارسی میں دیکھیے تو ہر شخص جانتا ہے کہ فردوسی، انوری اور نظامی کے مقابلے میں جاہل تھا، تاہم انوری کو اس کی عبودیت کا اقرار ہے اور نظامی کہتے ہیں:

کہ آراست زلف سخن چوں عروس

جامی علم وفضل میں نظامی سے بڑھ کر ہیں۔غرض شاعری کا تعلق جذبات سے ہے معلومات سے نہیں۔

بہرحال جوخدمت ہمارے دوست نے اردوعلم وادب کی کی ہے،اہل زبان اس کے ہمیشہ مشکور ہوں گےاوراگر میں اہل زبان ہوتا تویقیناً میں بھی مشکور ہوتا۔

احب الشاعرین و لست منهم

شبلی

۱۹/جنوری ۱۹۱۱ء

[۱۲]

بحرالحکمت

بحرالحکمت مؤلفہ میر اصغر علی صاحب جعفری تعلقدار سمستانات علاقہ حیدرآباد دکن بہت مفید اور دلچسپ ہے۔ نصاب تعلیم میں داخل ہونا اس کا مفید ہے مگر کسی قدر اونچی جماعتوں کے لئے۔

فقط

شبلی نعمانی

معتمد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۲/مارچ ۱۹۱۳ء

[۱۳]

سرسید احمد خاں کا سفرنامہ پنجاب

سرسید احمد خاں کے سفرنامہ پنجاب کو سید اقبال علی نے سرسید کی زندگی ہی میں مرتب کیا تھا جسے ۱۸۸۴ء میں انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ نے شائع کیا۔ اس پر علامہ شبلی کا فارسی زبان میں لکھا مندرجہ ذیل دیباچہ شامل ہے۔

جمعے دانشوران وخرد پژوہان یورپ از پاستان زمان بہ ترتیب وتدوین دفاتر سیر وتواریخ مشغول ومشغوف بودہ اند و بالخصوص در تسوید سفرنامہا کہ از جنس تاریخ گزیدہ نوعی است وکار آگہی وعبرت اندوزی را گراں بہا سرمایہ ہنروران آں بلاد چہ زحمتہا کہ نہ برداشتہ وچہ مایہ کوششہا کہ بروے کار نیاوردہ۔

وچوں نوبت داوری بعرب رسید و زمانہ عنان فرماندہی بدست اسلامیان سپرد، ایشاں ہم سررشتہ ایں کار از دست نگذاشتند ودر اطراف واکناف عالم فرا رسیدہ سفرنامہا طراز بستند ونامہ را بدر وگوہر انباشتند کہ بسیارے را از اں در حال بلاد یورپ بطبع دردادہ اند۔

آرے آنچہ بشگفت آوردو حیرت افزاید آنست کہ در ممالک ہند ازیں گراں مایہ متاع اثر نتواں یافت۔ اگر کسی ازیں میاں از سیر وسیاحت بہرہ ہم گرفتہ باشد ہیچ از

حالات خویش بنامہ وخامہ نسپر دتا دیگراں را مایہ دانش وآ گہی تواند بود۔

ایں سفرنامہ احمدی کہ مولوی سید اقبال علی صاحب بہ تسوید او ہمت گماشتہ شک نتواں کرد کہ درنوردایں سفر آنچہ از حالات وواقعات پیش آمدہ است مرد ہوشمند بہیں نتیجہا از وتواند گرفت وکسی را کہ درد اسلام داشتہ باشد برنصرت ویاوری اسلامیاں تواند انگیخت ۔

اگر ایں نامہ چنانکہ ہوس کردہ ام درقوم جنبشے پدید آورد وایشاں را خون حمیت بجوش آمد وبرزبونی حالت خویش پے بردہ دررفع مذلت کوشیدند ودراکتساب ہر گونہ فضل ومزیت دامن سعی برمیاں زدند دانستم کہ شگرف کاری از دست شاں کشادو نالہ بجائے رسید ورنہ بیقین باید شناخت کہ چند روزے دیگر اسلام را بایں روز سیاہ نشستن است وبہی خواہان قوم راز مانے ہمچناں دل بامید موہوم بستن ۔

[۱۴]

الایمان

از: مولوی سید محمود علی

میں نے مولوی محمود علی صاحب پروفیسر کپورتھلہ رندھیر کالج کا رسالہ الایمان غور سے دیکھا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ غائت دقت نظر اور تحقیق کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ نہایت معتدل طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور موجودہ زمانہ میں ہر حیثیت سے مفید اور سودمند ہے۔ اس رسالہ نے اردو زبان میں ایک مفید اضافہ کیا ہے۔

شبلی نعمانی ناظم علوم وفنون ریاست حیدرآباد سکریٹری انجمن ترقی اردو

۶ر جون ۱۹۰۳ء

---

[۱۵]

ادیب الہ آباد

شاکر میرٹھی نے الہ آباد سے ادیب جاری کیا تو علامہ شبلی نے درج ذیل تاثرات لکھے۔ یہ تاثرات ادیب کے شمارہ اگست ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئے، بعد میں خدا بخش لائبریری جرنل ۷-۸ میں اس کا عکس شائع ہوا۔

ادیب کے حسن ظاہری میں کیا شک اور حسن معنوی میں بھی اردو کے کسی رسالہ سے کم نہیں۔ یا یوں کہئے کہ کوئی رسالہ اس سے بڑھ کر نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب ایک محدود دائرہ سے آگے قدم بڑھانا چاہئے۔ اب تک جو کچھ ہو رہا ہے، یا اپنی داستانیں ہیں یا یورپ کی نہایت سرسری معلومات۔ اس سے زبان کی ترقی کا قدم آگے نہیں بڑھتا۔ کوشش کی جائے کہ ہربرٹ اسپنسر اور ہکسلے وغیرہ کا فلسفہ اردو زبان میں آئے۔ انگریزی سے اردو میں جو کچھ منتقل ہو رہا ہے اوچھے اور ادنیٰ درجہ کے معلومات ہیں۔ ان کو کہاں تک بار بار پڑھئے۔ یورپین معلومات کے لحاظ سے آج سے دس برس پہلے ہم لوگ جہاں تھے اب بھی وہیں ہیں۔

(اورینٹل کالج میگزین لاہور۔ ج ۵۶: ۱، ۲۲۴)

---

[۱۶]

ماہنامہ عصر جدید، میرٹھ

''خواجہ غلام الثقلین [۱۸۷۲-۱۹۱۵ء] نے جنوری ۱۹۰۳ء میں میرٹھ سے ماہنامہ عصر جدید جاری کیا، اس سلسلہ میں انہوں نے علامہ شبلی سے کچھ دریافت کیا تو علامہ شبلی نے اس کے جواب میں جو تحریر لکھی اسے عصر جدید میں شائع کیا گیا ہے۔''

عصر جدید کو میں نے اس نگاہ سے دیکھا کہ وہ علمی مخزن ہے۔ اس بنا پر دو تین پرچوں تک افسردہ رہا لیکن جب یہ یقین ہوا کہ وہ اصلاحات کے عمل میں لانے کا ایک آلہ ہے تو میری رائے بدلنے لگی۔ بے شبہ موضوع کے لحاظ سے وہ مفید اور کارآمد ہے۔

.... مسلمانوں کو کفایت شعار بنانے کی صرف دو صورتیں ہے اولاً عورتوں کی تعلیم، کیونکہ مصارف رسمی میں بڑا حصہ انہی کا ہے۔ دوسرے چند افراد کا نمونہ بننا۔ ایک عملی آدمی ہزار اسپیکروں سے زیادہ مفید ہے۔

ماہنامہ عصر جدید میرٹھ

فروری ۱۹۰۴ء

باب چہارم

مکتوبات

مکتوبات

علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کے اب تک 1091 مکاتیب مدون ہوکر کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں جس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ مکاتیب شبلی اول۔مولانا سید سلیمان ندوی۔دارالمصنّفین ۲۰۱۰ء ۴۰۰خطوط

۲۔ مکاتیب شبلی دوم۔مولانا سید سلیمان ندوی۔دارالمصنّفین ۲۰۱۲ء ۳۷۹خطوط

۳۔ خطوط شبلی، مولوی امین زبیری، مقدمہ ڈاکٹر شمس بدایونی، دہلی ۲۰۱۷ء ۱۰۳خطوط

۴۔ مکتوبات شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔اعظم گڑھ۔۲۰۱۲ء ۲۰۹خطوط

میزان ۱۰۹۱خطوط

راقم کی کتاب مکتوبات شبلی کی اشاعت (۲۰۱۲ء) کے بعد سے اب تک ۲۴/خطوط دریافت ہو چکے ہیں جو درج ذیل ہیں:

---

[۱]

شیخ حبیب اللہ کے نام

علامہ شبلی جب لاہور میں مولانا فیض الحسن سہارن پوری کے زیر استفادہ تھے۔اسی زمانہ سے والد شیخ حبیب اللہ سے خط و کتابت کا

آغاز ہوااور شیخ صاحب کی وفات نومبر ۱۹۰۰ء تک قائم رہا، لیکن یہ اثاثہ ضائع ہوگیا، شیخ حبیب اللہ کے محض ۶ ر خطوط، ۴ر اردو کے اور دو فارسی کے مکاتیب شبلی اول و دوم میں شامل ہیں۔ یہ ساتواں خط مکاتیب مہدی حسن سے ہاتھ آیا ہے:

''والد صاحب!

میں کسی کا خط کھولنا معیوب سمجھتا ہوں مگر مہدی کا خط مدت سے نہیں دیکھا تھا، علاوہ اس کے آپ کے نام کا خط مخفی راز ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ جرأت ہوئی۔ میں اب تک بیمار ہوں، شدت کا بخار ہر روز رہتا ہے۔ جنید کا بھی یہی حال ہے۔

میں کل اعظم گڑھ آ گیا ہوں، ڈاکٹر کا علاج ہوتا ہے۔''

شبلی

۱۷ر اکتوبر ۱۸۸۶ء

(ماخذ: ماہنامہ ادیب علی گڑھ، جولائی اگست ۱۹۶۳ء ص ۷)

---

[۲]

منشی نجم الدین کے نام

منشی نجم الدین [۱۸۷۰-۱۹۶۰ء] سر سید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] کے رفیق اور علی گڑھ کے شیخ زادوں میں تھے، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اکاؤنٹنٹ رہے۔ عمدہ خوش نویس بلکہ زود نویس تھے۔ قدیم کتب و مسودات کی نقل و تبیض کا کام مہارت سے کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سر سید کو کسی کتاب کو نقل کرانے کی ضرورت پیش آئی

اورانہوں نے علامہ شبلی سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے منشی نجم الدین کا ذکر کیا اوران کو لکھا:

''نجم الدین!

سید صاحب ایک کتاب لکھوانا چاہتے ہیں لیکن وہ صرف دو ہفتے کے لئے مستعار ملی ہے۔تم سے مفصلہ ذیل باتوں کا جواب مطلوب ہے:

۱۔تم مدرسے سے رخصت لے سکتے ہو یا نہیں اور لے سکتے ہوتو کب سے، کیوں کہ آج اگر رخصت ملے تو آج ہی سے کام شروع ہوجانا مقصود ہے۔

۲۔یہیں آ کر کتاب لکھنا ہوگا،صبح سے شام تک،کھانا دن کا سید صاحب کے ہاں سے ملے گا۔

۳۔اجرت خواہ اجزا پر خواہ ماہانہ حساب سے۔غرض جس طرح مرضی ہو مل سکے گی۔

والسلام

جواب طلب شبلی نعمانی''

یہ خط ڈاکٹر مختار الدین آرزو[۱۹۲۴-۲۰۱۰ء]نے اپنے مضمون سرسید کے ایک رفیق منشی نجم الدین مشمولہ فکرونظر علی گڑھ ستمبر۱۹۸۵ء میں عکس کے ساتھ درج کیا ہے۔خط پر تاریخ درج نہیں لیکن مذکورہ مضمون میں اسے جون ۱۸۸۹ء کا بتایا گیا ہے۔

---

[۳]

مولانا ارشاد حسین رام پوری کے نام

''مخدومی ومطاع مادامت افضالہم پس از ادائے مراسم تحیت وتسلیم آنکہ

ملازمان عالی کومعلوم ہوکہ بہت جدوجہد سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری لکھ رہاہوں جس کے لئے میں نے بہت سے موادتاریخی فراہم کئے،اس وقت جو جزوزیرتحریرہے وہ ان کے فتاوے ہیں، عقودالجمان میں ان کے چندفتاوے مذکور ہیں لیکن دوجگہ مجھ کو شک پیداہوا، اس لئے ان کوعرض کرتاہوں کہ تشفی فرمائی جائے۔اصل عبارت لکھ کرشبہہ لکھتاہوں:

قال ابوحنیفة یاابالخطاب ماتقول فی رجل غاب عن اھله اعواماونعی الیھافظنت امرأته انه میت فتزوجت ثم قدم زوجهاالاول وقدولدت ولداًفنفاه الاول وادعاه الثانی اکل واحد منھمااقذفھماام الذی انکرالولد ماالجواب فیھا.

مجھے اس میں شبہ یہ ہے کہ دونوں زوجوں میں سے کسی نے اس کوزانیہ نہیں کہاپھرقذف کے کیامعنی، باقی یہ امرکہ ولدیت کےادعااورانکارسےضمناًقذف لازم آتاہے۔اس پردوسوال ہیں [۱] کیا ایسی دلالت التزامی سے قذف کاجرم قائم ہوسکتاہے؟[۲] وہ عورت درحقیقت زانیہ ہوئی یانہیں،اگرہوئی توکیاواقعیت کااظہار قذف میں داخل ہے؟ایسا تفصیلی جواب عنایت ہوجواصل مسئلہ کوحل کردےاورامام صاحب کےاس سوال کی حقیقت کھول دے۔

دوسرافتویٰ یہ لکھاہے کہ چندآدمی ایک جگہ بیٹھے تھے،ایک شخص پرسانپ آکر گرا،اس نے دوسرے پر پھینک دیا۔اسی طرح تین چارآدمی تک نوبت پہنچی،اخیر میں اس نے ایک شخص کوکاٹ لیااوروہ مرگیا۔امام صاحب نےفتویٰ دیاکہ اگرگرنے کے ساتھ سانپ نے کاٹا تواخیر پھینکنے والے پر دیت لازم آئے گی اوراگر وقفہ ہواتوکسی پرنہیں۔اس پر یہ شبہ پیداہوتاہے کہ جس شخص نے پھینکایہ اس کااضطراری فعل تھا،اس اضطراری فعل پروہ کیوں ماخوذہو،فقہ میں اس کےمتعلق کیاامرقراردیا

ہے، جواب جلد تر مرحمت ہو، ورنہ میرا حرج ہوگا۔

فقط
شبلی

(ماخذ: فتاویٰ ارشادیہ، حصہ اول ص ۲۰۱-۲۰۲)

---

[۴]

مولوی محمد سمیع کے نام

مولوی محمد سمیع مرحوم علامہ شبلی کے عزیز اور ابتدائی دور کے عزیز ترین شاگرد تھے۔ انہیں علامہ شبلی سے عشق تھا، علامہ شبلی کی وفات کے بعد ان کے خطوط اور اشعار کا ایک ذخیرہ جو ان کے پاس محفوظ تھا سید صاحب کو فراہم کیا۔ سید صاحب نے لکھا ہے کہ مکاتیب شبلی کو ذی ثروت بنانے میں ان کا بڑا قابل قدر حصہ ہے۔

مولوی سمیع صاحب موضع کونرہ گہنی ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے غالباً دیوبند سے تعلیم پائی تھی، علامہ شبلی نے مسلمانان اعظم گڑھ کی تعلیمی ترقی کے لئے جو مجلس موازنہ ترقی قومی قائم کی تھی اس کے سکریٹری مولوی محمد سمیع مرحوم ہی تھے۔ ۱۹۱۶ء میں جب مکاتیب شبلی شائع ہوئی اس وقت مولوی سمیع صاحب جون پور میں محافظ دفتر ججی تھے۔ انہوں نے کب وفات پائی اور کہاں تدفین ہوئی، ان کی آل واولاد کہاں آباد ہے، کسی قسم کی تفصیل دستیاب نہیں، معارف میں ان کی وفیات نہ لکھنے کا سبب خدا جانے کیا تھا، اعظم گڑھ میں علامہ شبلی کے

عزیز ترین شاگرد تھے بعد میں انہی کی ماموں زاد بہن سے علامہ کا دوسرا نکاح ہوا، جنہوں نے ۱۹۰۴ء میں بندول میں وفات پائی اور وہیں دفن بھی ہوئیں۔ ان کے جنازے میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی شامل ہوئے تھے۔

ان کے نام علامہ شبلی کے ۶۸ رخطوط مکاتیب شبلی کے دونوں حصوں میں شامل ہیں۔ (۵۷ راردو اور ۱۱ رفارسی)۔ حیات شبلی میں دو اور خطوط ملے جو یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

''اپنے ارادہ سے جلد مطلع کرو، میں انشاء اللہ اسی مہینہ کے آخر میں روانہ ہو جاؤں گا،...... کشمیر میں جانے سے ممکن ہے کہ تمہارے ظاہری رنگ میں فرق آئے، یعنی نتواں شستن اززنگی سیاہی غلط ہو جائے۔''

شبلی

۱۰ راپریل ۱۸۹۲ء

(ماخذ: حیات شبلی ص ۱۷۱)

---

[۵]

مولوی محمد سمیع کے نام

میں غالباً ۲۳ یا ۲۴ ردسمبر کو یہاں سے روانہ ہوتا ہوں، اگر تمہارا قصد اعظم گڑھ کا ہو تو انتظار کرو کہ میرا ساتھ ہو اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو لکھ بھیجو۔ میں نے سردست سال بھر کی رخصت لی ہے۔

والسلام

شبلی

علی گڑھ

۵/دسمبر ۱۸۹۶ء

(ماخذ: حیات شبلی ص ۲۶۲ حاشیہ)

---

[۶]

میر صدر الدین حسین خاں کے نام

نواب میر صدر الدین حسین خاں رئیس بڑودہ نے ایک خط کے ذریعہ علامہ شبلی سے استفسار کیا کہ ناموران اسلام میں صرف سیرۃ النعمان اور المامون شائع ہو سکیں دیگر سوانح عمریوں کی تصنیف و اشاعت میں تاخیر کے اسباب کیا ہیں۔ علامہ شبلی نے ان کے جواب میں جو خط لکھا تھا اسے شیر علی خاں سرخوش نے نیرنگ خیال نومبر ۱۹۲۴ء میں شائع کرادیا ہے:

''جناب من تسلیم

والا نامہ پہنچا مشکور کیا، بے شبہ میں نے بہت سے وعدے کئے تھے لیکن صورت یہ ہے کہ ایک الفاروق کی تالیف میں آج پانچواں برس ہے برابر مصروف ہوں اور ابھی تک انجام کو نہیں پہونچی، اس لئے ترکی کا سفر کیا ہندوستان کے تمام کتب خانے چھانے، یورپ سے کتابیں منگوائیں اس پر بھی کتاب ناتمام ہے۔ قرطبہ اور نیشاپور کے درباروں کے سین دکھانے کے لئے ان ملکوں کا سفر کرنا چاہئے، اس کے لئے روپیہ کہاں سے آئے۔ قوم کی قدر دانی کا یہ حال ہے کہ کتاب کا ایک دو

ایڈیشن بک جانا قدر دانی کی معراج سمجھی جاتی ہے۔ میں کچھ دولت مند آدمی نہیں۔ تاہم کل مصارف خود اپنے پاس سے برداشت کئے اور کرتا ہوں۔اس میں جو کچھ بن آجاتا ہے اس کو غنیمت خیال کیجئے۔ باقی پوری سرگرمی سے کام ہونا تو ہم مسلمانوں سے کہاں ہوسکتا ہے۔ یہ قرعہ اب دوسروں کے نام ہے۔ **و تلک الایام ندا و لھا بین الناس.** والتسلیم

شبلی نعمانی

الہ آباد

۱۱رستمبر ۱۸۹۷ء''

---

[۷]

نامعلوم

''حامد کے مفرور ہونے کا قصہ تم نے پہلے سنا ہوگا، ۱۱راپریل کو میرے پاس ان کا خط آیا کہ'' مجھ کو اب بھول جایئے'' اس خط سے اس قدر پریشانی ہوئی کہ میں بالکل بدحواس ہوگیا، چار وقت تک کھانا نہ کھایا گیا اور ہر وقت رویا کرتا تھا۔

اسی اثنا میں شادی کی تاریخ آئی، لوگوں کو اصرار تھا کہ تاریخ نہیں ٹالنی چاہیے لیکن مجھ کو دل پر قابو نہ تھا، نہ جاسکا۔ ادھر مہمان وغیرہ آچکے تھے اور اس وجہ سے ان لوگوں کی بہت سبکی ہوئی۔ وہاں سے سمیع آئے کہ اعظم گڑھ ہی میں نکاح ہوجائے ، میں اس پر بھی راضی نہ ہوا، البتہ زیور اور کپڑا بھیج دیا کہ بعد طبیعت ٹھہرنے کے عقد ہوجائے گا۔

میاں حامد چندروز دربھنگہ میں رہ کر وہاں سے بھی کہیں چل دیے اور بالکل

پتہ نہیں اور غالباً مہینوں پتہ نہ لگے۔

شبلی

۲۱/اپریل ۱۹۰۰ء"

(ماخذ: حیات شبلی ص ۲۸۳-۲۸۴)

---

[۸]

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری سکریٹری کے نام

یہ خط آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری سکریٹری
کے نام ہے اور "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال" مرتبہ
امان اللہ خاں شروانی کے صفحہ ۲۱۸ پر شائع ہوا ہے۔

"مکرمی! تسلیم

جواباً عرض ہے کہ دفتر حیدر آباد میں ہے۔ میں نے مدت ہوئی لکھا اور جواب آیا کہ روانہ کیا جاتا ہے اب تک نہ آیا۔ اب بہ تاکید مزید لکھا ہے۔

رجسٹر میرے پاس ہیں۔ وہ آج سکریٹری صاحب کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں۔

شبلی

لکھنؤ

۲۰/فروری ۱۹۰۱ء"

---

[۹]

نامعلوم

رخصت ملنے کی توقع نہیں اس لئے شاید کلکتہ نہ پہونچ سکوں لیکن ایک مرتبہ ندوہ میں اعلان کر دیجئے کہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ سب چھوڑ چھاڑ کر ندوے کے آستانے پر آ بیٹھوں اور اپنی تمام عمر اس کی خدمت میں صرف کر دوں۔

شبلی

(ماخذ: روداد اجلاس ہفتم ندوۃ العلماء دسمبر ۱۹۰۱ء ص ۱۰)

---

[۱۰]

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام

حبیب شبلی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی [۱۸۶۶-۱۹۵۰ء] سے شبلی کے بڑے گہرے مراسم اور کثرت سے خط وکتابت رہی۔ مکاتیب شبلی میں ان کے نام ۱۱۸/خطوط، مکتوبات شبلی میں ۲۴/خطوط اور بعد میں دریافت ہونے والے ۲/خطوط کے بعد حال میں ان کے نام ایک اور خط دریافت ہوا ہے جو ماہنامہ الندوہ کی اشاعت سے پہلے کا ہے۔ یہ خط مقالات یوم شبلی [مطبوعہ: مسلم اکیڈمی لاہور۔ ۱۹۶۸ء] میں شامل ہے، اس کے مرتب علامہ شبلی کے ایک شیدائی حافظ نذر احمد [م: ۲۰۱۱ء] ہیں۔ انہوں نے علامہ شبلی کے نام پر لاہور میں شبلی کالج قائم کیا تھا جسے انہوں نے آخر دم تک قائم رکھا اور جس

سے بے شمار طلبہ نے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ حافظ نذر احمد مرحوم نے ۸/ مئی ۱۹۶۸ء کو شبلی کالج لاہور میں قیام پاکستان [۱۹۴۷ء] کے بعد پہلی بار بڑے تزک و احتشام کے ساتھ یوم شبلی کا انعقاد کیا جس کی صدارت ڈاکٹر سید عبداللہ نے کی اور جس میں پاکستان کے ممتاز اہل قلم نے شرکت کی اور مقالات پیش کئے۔ جولائی ۱۹۶۸ء میں ان مقالات کو کتابی صورت میں شائع کیا گیا، اس میں تبرک کے طور پر علامہ کی ایک غیر مطبوعہ غزل اور ایک خط بھی شامل کیا گیا ہے، یہ خط اگست ۱۹۰۲ء کا مکتوبہ ہے۔ حافظ نذر احمد کو یہ خط کہاں سے دستیاب ہوا اس کی کوئی تفصیل نہیں دی گئی ہے۔

''مکرمی تسلیم

نہایت خوشی ہوئی کہ ندوہ کا رسالہ نکلنا تجویز ہوا اور آپ کی اڈیٹری میں، تنہا اس بار کو اٹھاتے ہوئے گھبراتا تھا لیکن اگر آپ چاہیں تو اڈیٹری میں شرکت کر سکتا ہوں، رسالے کا پراسپکٹس عنایت فرمایئے گا۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ علماء کو قائل کرنا ان کے مذاق کی رعایت سے ہو سکتا ہے اس لئے ہر پرچہ میں علوم قدیمہ میں سے کسی ایک پر ناقدانہ اور محققانہ ریویو بھی ہونا چاہئے۔ میرے خیال میں جو پیمانہ ہے اس کو لکھ کر بھیجوں گا یا زبانی کہوں گا۔ الغزالی کا اشتہار دے دیا گیا لیکن اب تک کتاب چھپ کر نہیں آئی۔

شبلی

اگست ۱۹۰۲ء''

[۱۱]

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام

''عزیز مرحوم کے واقعہ نے مجھ پر اس قدر سخت اثر کیا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا تھا، حالاں کہ مہدی مرحوم کا واقعہ اسی درجہ کا گذر چکا تھا، بہرحال میں اعظم گڑھ چلا آیا، محمڈن شبلی اسکول جو ۳۰/ برس ہوئے میں نے قائم کیا تھا، ہائی اسکول سے مڈل اسکول تک آ گیا، عزیز مرحوم اس کو انٹرنس تک پہنچانا اور تمام برادری کے قصبات میں اسکول اور مکاتب قائم کرنا چاہتے تھے، دو مہینے کا دورہ رکھا تھا اور پانچ سو روپیے مصارف دورہ کے لیے الگ کر دیے تھے، اشتہارات اور رسید یہاں سب چھپ گئی تھیں۔ مجھ کو اس کام کے علاوہ دارالمصنّفین اور دارالتکمیل کی فکر ہے، ندوہ میں کام کرنا ممکن نہ تھا، ٦ برس تک کشاکش میں گزرے، جو ہو گیا وہ تعجب انگیز ہے، بہرحال صورت موجودہ یہ ہے کہ اسکول کے پاس ہی میرا اور میرے خاندان کا باغ ہے، جس کا کل رقبہ گیارہ بیگہ پختہ ہے، اس کو وقف کر رہا ہوں، اور شرکا بھی راضی ہو گئے ہیں، مسودہ لکھا جا چکا، رجسٹری کرانا ہے، دو بنگلے پہلے سے موجود ہیں، کتب خانہ [دوبارہ] بقدر معتد بہ مہیا ہو گیا ہے اور بڑھتا جاتا ہے، دفتر سیرت کا کل سرمایہ اس طرف منتقل ہو جائے گا بلکہ صرف کتب خانہ کے لیے کافی ہوگا اور دارالمصنّفین کی عمارت کے لیے کچھ اضافہ ہوگا، چاہتا ہوں کہ اس کے چار کمرے چار عناصر اردو کے نام سے تعمیر ہوں اور عمارت پر تمام موجودہ معززین ارباب قلم کے نام کندہ ہوں، چندہ مشروط نہیں، ہر صاحب قلم چندہ دے بھی نہیں سکتا، اس کے ساتھ دارالتکمیل کھول رہا ہوں، یعنی ادب اور تفسیر کی تکمیل کے طلبہ کو تیار کروں، دو مددگار ہوں گے، انتہائی صفوں کو خود پڑھاؤں گا، سردست طلبائے تصنیف کی تعلیم کا یہ طریقہ ہوگا کہ پہلے چھوٹے چھوٹے

عنوانات اور ان کے متعلق ذخیرۂ معلومات اور کتابیں ان کو دی جائیں گی، جو کچھ لکھیں گے،اس کا عیب و ہنر بتایا جائے گا، پھر پمفلٹ، رسالے اور پھر تصانیف کرائی جائیں گی، وظائف تصنیفی مقرر ہوں گے جو کم از کم ۲۰، ۲۵ روپیے ماہوار ہوں گے، دستاویز کی رجسٹری ہوجائے تو باغ کی کانٹ چھانٹ اور عمارت کی داغ بیل ڈالی جائے،ایک کمرہ مرحوم کے نام سے بھی تعمیر کرانا مقصود ہے، یہ آخر عمر کا خواب ہے اور امید ہے کہ:ع

چوں ہنر ہائے دگر موجب حرماں نہ شود

نواب عمادالملک نے دارالمصنّفین کی صدر انجمنی قبول کرلی ہے۔ تکمیل دستاویز کے بعد انجمن کے قواعد اور ممبروں اور عہدہ داروں کے نام شایع ہوں گے۔

والتسلیم

شبلی

۱۶/اپریل۱۹۱۴ء

(ماخذ: حیات شبلی ص ۵۱۸-۵۱۹)

---

[۱۲]

مولانا ابوالکلام آزاد کے نام

علامہ شبلی کے ان خاص لوگوں میں ہیں جنہوں نے ان کے فکر ونظر کا تتبع کیا۔ان سے علامہ شبلی کی کثرت سے خط وکتابت رہی۔ مکاتیب شبلی اور مکتوبات شبلی میں مولانا آزاد کے نام ۷۹/خطوط شامل ہیں۔ زیر نظر خط کی دریافت سے جولسان الصدق کے صفحات میں ملا

ہے۔خطوط کی مجموعی تعداد ۸۰/ ہوگئی ہے۔

یہ خط اپنے مشمولات کی وجہ سے بے حد اہم ہے۔

مکرمی!

آپ کا دلچسپ والا نامہ پہنچا۔

.........................ترجمہ کا میں مخالف نہیں ہوں، گذشتہ تعلیم میں سرسید نے مجھ سے وہ عبارت بہ جبر لکھوادی تھی، میں نے سخت انکار کیا تھا لیکن ان کا اصرار غالب آیا، میں تو ترجمہ کو اصل علمی خدمت سمجھتا ہوں بلکہ انشاء اللہ اس کا ایک باضابطہ سررشتہ قایم کروں گا۔

شبلی

۲۲/ مارچ ۱۹۰۳ء

(ماخذ: لسان الصدق، اگست ستمبر ۱۹۰۴ء، عبدالقوی دسنوی ص ۲۰۰-۲۰۱)

---

[۱۳]

مولانا اشرف علی ایم اے کے نام

علمائے صادق پور میں مولانا محمد اشرف علی ایم اے عربی [۱۸۴۳-۱۹۰۸ء] بڑے لائق فائق اور عالم فاضل شخص تھے۔علوم دینیہ کے ساتھ علوم جدیدہ انگریزی، ریاضی اور طب وغیرہ میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔ کچھ دنوں تک اودھ اخبار لکھنؤ کے ایڈیٹر اور بنارس میں ریاضی کے اسسٹنٹ پروفیسر رہے۔ فارسی کے بلند رتبہ شاعر تھے۔علامہ شبلی کے ان سے گہرے روابط تھے۔ان کے نام شبلی کا ایک خط ماہنامہ معاصر پٹنہ ستمبر ۱۹۴۲ء [ص ۳۲-۳۳] میں شائع ہوا

ہے۔ جسے بعد میں ڈاکٹر مختار الدین آرزو نے علی گڑھ کالج میگزین
۴۹-۱۹۴۸ء میں بھی شائع کیا۔

''مولانا!

آپ کے فضل و کمال کا مجھ سے زیادہ کون معترف ہوگا باوجود اس کے میں نے انجمن اردو میں آپ کو تکلیف نہیں دی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں نے اس طرف آپ کے میلان کا کوئی ذکر نہیں سنا تھا۔ آج ایک صاحب کے خط سے کچھ امید بندھی تو یہ عریضہ لکھتا ہوں۔ روداد انجمن اردو ارسال خدمت ہے۔ سب سے بڑا کام لغات علمیہ کا ترجمہ ہے۔ ناگری پرچار سبھا نے سات جلدوں میں سائنٹفک لغت تیار کر لیا۔ لیکن ہمارے یہاں کون کرے گا۔ انگریزی داں عربی سے کورے ہیں و بالعکس مصطلحات کمسٹری الگ چھپوا لئے ہیں، وہ بھیجتا ہوں۔ کیا آپ اس کا کوئی حصہ ترجمہ فرما دیں گے؟ ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ارسطو کی منطق کا جو انگریزی میں ترجمہ ہوگئی ہے، ترجمہ کیا جائے تا کہ موازنہ ہو سکے کہ مسلمانوں نے اس پر کیا اضافہ کیا۔ دوسرا کام میں کر دوں گا، لیکن کیا آپ پہلا کام کر دیں گے۔ غرض آپ اس مد میں جو کچھ کر سکیں اس سے مطلع فرمائیں۔

شبلی

حیدرآباد۔ ۴؍ مئی ۱۹۰۴ء''

---

[۱۴]

ایڈیٹر وکیل امرت سر کے نام

سید محمود [۱۸۵۰-۱۹۰۳ء] نے جس وقت انتقال کیا علامہ
شبلی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے اور تراجم کا ایک بڑا منصوبہ ان

کے پیش نظر تھا چنانچہ کسی شخص نے وکیل امرت سر میں لکھا کہ انجمن ترقی اردو سید محمود کی کتابوں کے ترجمے کروا کر شائع کرے۔ اس کے جواب میں علامہ شبلی نے ایڈیٹر وکیل کو ایک خط لکھا جو ۱۳/نومبر ۱۹۰۴ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔

''مکرمی!

اخبار وکیل میں مضمون جو سید محمود مرحوم کی تصنیفات کے ترجمہ کے متعلق چھپا ہے میں نے پڑھا۔ سید محمود صاحب کی خدمت میں مجھ کو ایک مدت مدید تک نیاز حاصل رہا ہے۔ ان کی کوئی تصنیف انگریزی یا کسی اور زبان میں بجز شرح قانون شہادت نہیں ہے۔ شفعہ پر انہوں نے ایک بسیط کتاب لکھنی چاہی تھی۔ بہت سا مواد فراہم ہو چکا تھا، کچھ اجزا چھپے بھی تھے لیکن کتاب ناتمام رہی۔

مرحوم اخیر زندگی میں صرف اپنا سایہ ہو گئے تھے۔ اس عالم میں محض مشغلہ گفتگو کے طور پر وہ اپنی بہت سی تصنیفات کا ذکر کرتے تھے اور لوگوں کو ادھر ادھر کے دو چار صفحے دکھا دیا کرتے تھے اس سے لوگوں کو دھوکہ ہوتا تھا۔

ان فرضی تصنیفوں کا انہوں نے صرف ایک ابتدائی خاکہ قائم کیا تھا اور دو چار صفحے لکھ بھی لئے تھے۔ باقی بے شبہ اگر ان کی کوئی تصنیف موجود ہوتی تو ترجمہ کے قابل ہوتی۔

شبلی''

---

[۱۵]

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کے نام

مشہور حساب داں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس

چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد [۱۸۷۸-۱۹۴۷ء] کو علامہ شبلی سے خاص عقیدت تھی۔ انہوں نے اپنی مجلس مقنّنہ کی تقریروں میں علامہ شبلی کے متعدد مقامات پر حوالے دئے ہیں۔ انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تاسیسی جلسہ میں میجک لینٹرن سے لکچر دیا اور علمائے کرام کو ہیئت کے مسائل سمجھائے۔ (العلم کراچی، جنوری ۱۹۵۲ء۔ ص۴۲)

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد جس وقت جرمنی میں زیر تعلیم تھے اس وقت علامہ شبلی سے ان کی خط و کتابت تھی۔ اسی دور کا ایک خط ماہنامہ العلم کراچی جنوری ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا ہے، اس سے ایک دوسرے سے مراسم اور علم و تحقیق سے دونوں کے گہرے شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔

''مجبی

آپ کا خط مجھ کو کچھ دیر میں ملا کچھ اور اسباب سے جواب میں تاخیر ہوئی۔

۱۔ قانون مسعودی رام پور کے کتب خانہ سرکاری اور قاہرہ کے کتب خانہ خدیویہ میں موجود ہے۔

۲۔ ابو ریحان کی تصانیف کی فہرست مفصل، ترجمہ انگریزی کتاب الہند مصنفہ ابو ریحان بیرونی مطبوعہ لندن ۱۸۸۷ء میں جس قدر دی ہے۔ اس سے زیادہ نہیں مل سکتی۔

۳۔ اس کی اکثر تصنیفات علم ہیئت کتب خانہ خدیویہ میں موجود ہیں۔

۴۔ عمر وخیام کی تصنیفات حسب روایت، تاریخ الحکماء شہرزوری جس کا قلمی نسخہ میرے پاس موجود ہے حسب ذیل ہے۔

ایک مختصر رسالہ طبیعات میں۔ ایک رسالہ وجود کی حقیقت پر۔ ایک رسالہ لکون و تعلف پر۔ عرایس النفایس

۵۔ابوریحان کا سنہ وفات طبقات الاطباء ابن ابی اصیبعہ میں ۴۳۰ لکھا ہے اور کتاب مذکورہ بہت مستند خیال کی جاتی ہے۔

۶۔ابوریحان کی کتابیں کتب خانہ رام پور۔ وپٹنہ۔ وقاہرہ میں مل سکتی ہیں۔

مسلمان ریاضی دانوں میں سے ابوالوفاء جوز جانی۔ بتانی خازن بڑے پایہ کے لوگ اور مجتہد الفن ہیں ان کی تحقیقات پر بھی توجہ کیجئے۔

شبلی نعمانی

اعظم گڑھ

۳۰/جنوری ۱۹۰۵ء''

---

[۱۶]

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کے نام

یہ خط ماہنامہ معارف کے شبلی نمبر (ص ۲۱۵) سے لیا گیا ہے

اور مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں خط محفوظ ہے۔

تسلیم، ہاں میں مقطوع الرجل ہو گیا، خدا کا شکر ہے۔ زخم کی تکلیف ابھی تک ہے۔ موازنہ سے متبعین دبیرؔ تو ناراض ہوئے ہوں گے۔ معلوم نہیں ارباب انیسؔ کا کیا خیال ہے؟

والسلام

شبلی

۲۷/جولائی ۱۹۰۷ء

---

[۱۷]

سید عبدالحی حسنی کے نام

یہ خط ڈاکٹر شمس بدایونی کو مولانا ہارون صاحب لائبریرین علامہ شبلی نعمانی لائبریری ندوۃ العلماء سے ملا تھا۔ انہوں نے اسے اپنے مضمون مشمولہ معارف شبلی نمبر میں درج کیا ہے۔

مولانا سید عبدالحی حسنی کے نام علامہ شبلی کے ۴؍خط مکاتیب شبلی اول میں ایک خط مکتوبات شبلی میں اور دو خط نو دریافت، اس طرح اب تک سات خطوط دریافت ہو چکے ہیں۔

مکرمی!

۱۔ دو تین ہفتے کے اندر جلسہ انتظامیہ کیجیے۔

۲۔ ایک تحریر بھیجتا ہوں یہ صرف ارکان موجودہ لکھنؤ اور مولوی خلیل الرحمٰن صاحب و مولوی حبیب الرحمٰن صاحب و مسیح الزماں صاحب کے پاس بھیجی جائیں۔ ارکان موجودہ لکھنؤ کے پاس ایک ہی نقل بھیجنا کافی ہوگا۔

۳۔ آپ کو جو ضروری امور پیش کرنے ہوں، قلم بند کر لیجئے۔ جلسہ میں آپ تاخیر نہ کیجیے۔ بہت سے کاموں کا ہرج ہوتا ہے اور اشاعت اسلام وغیرہ سب بیکار پڑے رہیں گے۔

شبلی

۱۴؍جون ۱۹۱۰ء

[۱۸]

سید عبدالحی حسنی کے نام

جناب مولانا سید عبدالحی صاحب

یہ امر اب مخفی نہیں رہا کہ ارکان ندوہ میں سخت ناچاقی ہے جو روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور جس کا اثر اب اعلانیہ پڑنے لگا ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کبھی آج تک یہ قصد نہیں کیا گیا کہ ناراض اصحاب آپس میں مل بیٹھ کر شکایتوں کا باہم اظہار کریں اور جس کی شکایت ہے وہ اپنا جواب پیش کرے، مجھ کو یقین ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو ضرور بہت سی شکایتیں رفع ہوگئی ہوتیں۔

یہ ظاہر ہے کہ ہم لوگوں میں کوئی خاندانی عداوت نہیں ہے، اس لئے ذاتی مخالفت کی کوئی وجہ نہیں، ہم لوگوں کو رو در رو تمام شکایتوں کو حل کر لینا چاہیے اور ایک طریقہ کارروائی آئندہ کے لئے منضبط کر لینا چاہیے، اس بنا پر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ دو تین دن کے اندر تمام معتمدین اور نائب ناظم صاحب کو ایک معین وقت میں تشریف لانے کی تکلیف دیں، میرا خیال ہے کہ صلح سے لڑائی کی بہ نسبت زیادہ کامیابی حاصل ہو سکتی ہے، جو قوت آپس کی مخالفت میں کئی سال سے صرف ہو رہی ہے، یہ ندوہ کی ترقی اور قوت میں صرف ہوگی۔

شبلی

۷/نومبر ۱۹۱۰ء، ۴/ذیقعدہ ۱۳۲۸ھ

(ماخذ: تاریخ ندوۃ العلماء حصہ دوم۔ صفحہ ۶۸)

[۱۹]

نامعلوم

جناب من

بعض صاحبوں کا خیال ہے کہ ترکوں کی ہمدردی میں اگر قربانی کے بجائے قیمت دی گئی تو اس سے احتمال ہوگا کہ قربانی خود غیر ضروری ہے، لیکن یہ صحیح نہیں۔ شریعت میں فرائض کے درجات میں بھی ترتیب ہے اور وقتی ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ غزوۂ خندق میں جہاد میں مصروف ہونے کی وجہ سے آنحضرت (ﷺ) کی نماز عصر قضا ہوئی تو کیا یہ حجت ہوسکتی ہے کہ نماز کا قضا کرنا جائز ہے؟

ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے۔ اس لئے اس خاص موقع اور ضرورت کے وقت اگر یہ فرض مقدم رکھا گیا تو اس سے آئندہ کے لئے کیا حجت ہوسکتی ہے؟ قربانی شعائر اسلام ہے۔ مسلمان اس کو نہیں چھوڑ سکتے۔ نہ کوئی قوم ان کو اس پر مجبور کرسکتی ہے، نہ وہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی کسی قوم کی پروا کرسکتے ہیں۔

امید کہ میرا خط اور صاحبان اخبار بھی اپنے پرچوں میں نقل کردیں۔

شبلی

---

[۲۰]

میر اصغر علی کے نام

یہ خط بحر الحکمت کے مصنف میر اصغر علی محلّہ عثمان شاہی اصغر منزل حیدر آباد دکن کے نام ہے۔ میر صاحب کے بارے میں مزید

تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔ یہ خط صحیفہ لاہور جنوری ۱۹۷۱ء (ص ۷۶) میں شائع ہوا ہے۔

''جناب من! سلام مسنون

آپ نے بہت مفید کتاب لکھی ہے۔ یہ ہر ایک کے لئے یکساں فائدہ رساں ہے۔ شکریہ قبول فرمایئے۔

شبلی

۶/مارچ ۱۹۱۳ء

لکھنؤ

---

[۲۱]

مولوی محبوب عالم کے نام

۲۴-۲۵/جنوری ۱۹۱۴ء کی درمیانی شب میں مشہور صحافی مولوی محبوب عالم [۱۸۶۸-۱۹۳۳ء] ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور کے یہاں آتش زدگی کا واقعہ پیش آیا جس سے ان کے مطبع اور لائبریری کو شدید نقصان پہونچا، مولوی محبوب عالم اس وقت سفر پر تھے اور ان کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالعزیز اخبار اور مطبع کے ذمہ دار تھے۔ اس ناگہانی حادثہ پر متعدد اشخاص نے پرسہ کیا اور خطوط لکھے۔ مولوی محبوب عالم نے وصیت نامہ لکھ کر اپنا تمام ذخیرہ علمی پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبریری کو دے دیا تھا۔ بعد میں اس ذخیرہ سے ایک البم برآمد ہوا جس میں آتش زدگی کے واقعہ پر اظہار افسوس کرنے والوں کے تار اور خطوط

محفوظ کیے گئے تھے اس میں ایک دوسطری خط علامہ شبلی کا بھی ہے جسے ماہنامہ ماہ نو کراچی اکتوبر ۱۹۶۷ء میں ملک احمد نواز نے شائع کرادیا ہے جو درج ذیل ہے:

''مکرمی

تسلیم! کارخانہ کی آتش زدگی کی خبر سن کر نہایت افسوس ہوا۔ امید ہے کہ خدا بہت جلد تلافی کر دے گا۔ سفر سے واپسی پر مبارک باد قبول فرمایئے۔

شبلی

لکھنؤ

۴ر فروری ۱۹۱۴ء''

---

[۲۲]

سید عبدالسلام کے نام

درج ذیل خط صحیفہ لاہور جنوری ۱۹۷۱ء (ص ۶۱) میں شائع ہوا ہے۔ اپنے مشمولات کے لحاظ سے بے حد اہم خط ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس خط کے اقتباسات حیات شبلی (ص ۴۷) میں عقائد خیالات کے ضمن میں نقل کئے ہیں اور حیات شبلی ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط سید عبدالسلام صاحب مالک مطبع فاروقی دہلی کے استفسار پر لکھا گیا اور ۹ر مئی ۱۹۱۴ء کا لکھا ہوا ہے۔

''جناب میر صاحب!

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

(۱) جس کا یہ عقیدہ ہو کہ مادہ قدیم ہے اور خدا کا مخلوق نہیں ہے وہ ملحد اور زندیق ہے۔ میں مادے کو نہ قدیم بالذات تسلیم کرتا ہوں نہ قدیم بالزمان البتہ میں یہ جانتا ہوں کہ خدا کے تمام اوصاف قدیم ہیں۔

الکلام میں اگر اس قسم کے اقوال مذکور ہیں تو وہ غیر مذہب والوں کے عقائد ہیں اور اس غرض سے نقل کئے ہیں کہ ان کا رد کیا جائے۔

(۲) نبوت کے متعلق میرا ہرگز یہ اعتقاد نہیں ہے کہ وہ اکتسابی ہے اور ہر شخص نبی ہوسکتا ہے، میں نبوت کو عطیہ الٰہی سمجھتا ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء یقین کرتا ہوں اور جو شخص اس بات کا قائل ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی ہوسکتا ہے اس کو مسلمان نہیں جانتا۔

(۳) باقی میرے عقائد وہی ہیں جو قرآن شریف اور احادیث سے ثابت ہیں۔ میں عقیدتاً اور فقہاً دونوں لحاظ سے اہل سنت و جماعت سے ہوں۔

شبلی نعمانی

دہلی''

---

[۲۳]

نائب ناظم ندوہ کے نام

جناب من! السلام علیکم

جلسۂ انتظامیہ مورخہ ۱۴رجون ۱۹۱۴ء کا ایجنڈا پہنچا۔ اس زمانہ میں غالباً میں ان اطراف میں نہ رہوں گا، میری صحت اب اس کی مقتضی نہیں کہ میں سیرت نبوی کے سوا زیادہ تر اور کسی طرف متوجہ ہوسکوں، بعض ضروری امور گزارش ہیں:

۱- جلسۂ دہلی کے متعلق میری رائے ہے کہ اس کا منشا ارکان ندوہ کی توہین یا شکست نہ تھی، بلکہ صرف یہ تھی کہ چوں کہ تین چار دفعہ خود ندوہ کے مختلف اور متعدد ارکان کی طرف سے اصلاح کی کوشش ہو چکی، مولوی عبدالباری صاحب اور میرزا ظفراللہ خاں صاحب کے خطوط مطبوعہ اور یادداشت مطبوعہ سب کے پیش نظر ہیں، باوجود اس کے کوئی توجہ نہیں دی گئی، اس لیے بعض لوگوں نے یہ مناسب خیال کیا کہ یہ مسئلہ پوری قوم کے سامنے لایا جائے، لیکن بعض لوگوں نے غلط فہمی سے یہ سمجھا کہ [اس کا مقصد] کسی شخص کو معتمد یا ناظم بنانا ہے، یا موجودہ کارکن صاحب کو برطرف کرانا ہے، اس لیے نہایت فریق بندانہ جوش پیدا ہوا، لیکن جلسہ میں ایک حرف ان امور کے متعلق نہیں کہا گیا، صرف چند اصحاب منتخب ہوئے کہ دستور العمل کے اصلی نقائص اور اس کی عدم پابندی کے متعلق اصلاحی اسکیم مرتب کریں، یہ اسکیم غالباً خود ارکانِ ندوہ کے سامنے پیش ہوگی، اس بنا پر جلسۂ دہلی کی کارروائی کے ساتھ مخالفت کی بہ ظاہر وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ سچ تو یہ ہے کہ ندوہ اب بالکل نئے سرے سے باقاعدہ ہونے کا محتاج ہے۔

۲- مولوی عبداللہ صاحب کی رپورٹ متعلق اسٹرایک دیکھ کر سخت حیرت ہوئی اس میں بعض باتیں تو ایسی ہیں جن کی شہادت صرف خدائے عالم الغیب پر محمول ہے، مولانا عبداللہ صاحب نے ایک نہیں متعدد دفعہ مجھ سے صحیح بخاری کے سبق روکنے پر اپنی مجبوری بیان کی اور کہا کہ میں کیا کروں؟ ناظم صاحب سے متعدد دفعہ نماز کے اوقات میں مسجد میں ملاقات ہوتی ہے اور وہ ہر دفعہ مجھ سے کہتے ہیں کہ بخاری پڑھنے والے لڑکوں کو خارج کر دیا یا نہیں لیکن اب تک میں نے نہیں خارج کیا'' میں نے کہا کہ آپ ان سے حکم لکھوا لیجیے، اس پر فرمایا کہ وہ باہر چلے گئے ہیں، آئیں گے تو میں لکھواؤں گا'' پھر یہ بھی کہا کہ ان کے واپس آنے تک لڑکے اگر بخاری پڑھیں تو مجھے

اعتراض نہ ہوگا۔

اب اگر مولانا موصوف ان واقعات سے منکر ہوں تو خدائے عالم الغیب کے سوا اور کون اس کا فیصلہ کرنے والا ہے؟

باقی قانونی حیثیت سے تو اس کی یہ کیفیت ہے کہ ندوہ جب سے قائم ہے، لڑکے باہر اساتذہ وغیر اساتذہ سے پڑھتے تھے، خود اس زمانہ میں جب یہ واقعہ پیش آیا، بہت سے لڑکے اور اسباق ......مثلاً خلیل صاحب [شیخ محمد عرب صاحب کے فرزند] سے......کیں، بخاری شریف کے سبق کے متعلق چوں کہ مولانا نے براہِ راست مجھ کو مخاطب کیا ہے، اس لیے یہ چند سطریں لکھنی پڑیں۔

۳- اسی رپورٹ میں میرے دارالاقامہ کے تعلق کا بھی ذکر ہے، اس کے متعلق کوئی شکایت ہے، تو میں اس کا ذمہ دار ہوں لیکن دارالاقامہ میری نگرانی میں کبھی براہِ راست نہیں رہا جو مہتمم ہوتا تھا، اسی سے اس کا تعلق رہتا تھا۔ یہ امور ضابطہ کی حیثیت سے لکھے گئے:

خاص طور پر میری یہ گزارش ہے کہ بہ جائے اس کے کہ باہمی مخالفت میں دو قوتیں ہمیشہ ٹکراتی رہیں، اسلامی (مصالح) کا یہ اقتضا ہے کہ دو تین شخصوں کو حکم مان کر تمام معاملات ان کے ہاتھ میں دے دیجیے جو فیصلہ وہ لوگ کریں سب منظور کرلیں، پھر وہ جلسۂ انتظامیہ میں باقاعدہ منظور ہوجائے، ورنہ تمام ہندوستان میں ہم سب کی سخت تضحیک ہوچکی اور ہوتی رہے گی، اس وقت اس بحث سے بھی قطع نظر کیجیے کہ جھگڑا کہاں سے شروع ہوا، کیوں کہ ہر فریق یہی سمجھتا ہے کہ دوسرا فریق برسرِ ناحق ہے، ایسے اشخاص خود ندوہ میں موجود ہیں، جن کی دیانت پر فریقین کو اعتماد ہے۔''

ممبروں کی خالی شدہ جگہوں کے لیے اشخاصِ ذیل موزوں ہیں:

ڈاکٹر ناظر الدین حسن (بیرسٹر)

مسٹر ممتاز حسین (بیرسٹر)
مولوی آزاد صاحب سبحانی کان پور
مولوی سید سلیمان پونہ، دکن

شبلی

۲۵/مئی ۱۹۱۴ء

(ماخذ: حیات شبلی ص ۵۱۰-۵۱۲)

---

[۲۴]

خواجہ کمال الدین کے نام

مبارک ہو

کامل اس فرقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی زندان قدح خوار ہوئے

کچھ کریں گے تو آپ ہی لوگ کریں گے اور سب آپ کا ساتھ دیں گے۔ رسالہ کے لئے احباب اور دوستوں کو لکھتا ہوں۔

شبلی

۲/مارچ ۱۹۱۴ء

یہ خط زمیندار لاہور ۲۷/اپریل ۱۹۱۴ء کو شائع ہوا۔ تفصیل کے لئے دیکھیں راقم کی کتاب شبلی اور جہان شبلی ص ۱۶۳-۱۶۴۔

باب پنجم

مراسلات

مراسلات

علامہ شبلیؒ [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] ایک بڑے مراسلہ نگار بھی تھے۔ انہوں نے متعدد اہم اور قابل تنقیح و تجزیہ امور سے متعلق اخبارات و رسائل میں مراسلے لکھے جن کا ایک مجموعہ ''مراسلات شبلی'' کے نام سے راقم نے مرتب کیا ہے اور جسے دارالمصنّفین نے ۲۰۱۶ء میں شائع کیا۔ اس مجموعہ میں ۲۶/مراسلے شامل ہیں۔ حال ہی میں دو اور مراسلے دریافت ہوئے ہیں جن سے سوانح شبلی کے بعد اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

---

[۱]

جامعہ مدینہ منورہ کا نظام و نصاب تعلیم

مدینہ یونیورسٹی کا نصاب تعلیم تیار کرنے کے لئے علامہ شبلی ان کے شاگرد مولانا حمید الدین فراہی [۱۸۶۳-۱۹۳۰ء] اور علامہ اقبال [۱۸۷۷-۱۹۳۸ء] منتخب ہوئے تھے۔ اس کی اطلاع گذشتہ دنوں

دریافت ہونے والے علامہ شبلی کے ایک مراسلہ سے ہوئی۔ وہ مراسلہ دارالمصنّفین کے ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی [پ: ۱۹۳۵ء] نے دریافت کیا تھا اور جو معارف دسمبر ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا تھا اور اب مراسلات شبلی میں شامل ہے۔ علامہ شبلی نے وہ مراسلہ زمین دار (۲۲/مئی ۱۹۱۳ء) میں اس لئے لکھا تھا کہ نصاب تعلیم کے سلسلہ میں اہل علم بالخصوص علماء مشورہ دیں اور ان کے مشورہ سے ایک جامع نصاب تعلیم تیار ہو سکے۔ اس سلسلہ کا ایک اور مفصل مراسلہ انہوں نے ہمدرد دہلی ۵/جون ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں لکھا ہے، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کے پیش نظر محض نصاب تعلیم نہ تھا بلکہ نظام تعلیم بھی تھا۔ وہ مراسلہ درج ذیل ہے:

میں نے ایک مطبوعہ خط کے ذریعے جو زمیندار میں شائع ہوا ہے، حضرات علما اور ارباب تعلیم جدید سے اظہار رائے کی درخواست کی ہے۔ اس کے متعلق مزید تفصیل کی ضرورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ''نظام'' ایک ایسا وسیع لفظ ہے اور اس کے دائرۂ عمل میں اس قدر مطالبات شامل ہیں جس کا روئے خطاب علما اور ایجوکیٹڈ سے سے مخصوص نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کو اس میں رائے دینے کا حق ہے اور تعمیم سوال بہر حال مفید ہے۔

''نظام'' میں یہ امور بھی داخل ہیں کہ جامعہ کے نظم ونسق میں تمام ممالک اسلامی کے لوگ شریک کیے جائیں۔ اس کی مجلس عمومی وخصوصی (سینٹ وسنڈیکیٹ) کے ممبر (فیلو) ہر ملک سے لیے جائیں۔ تمام اسلامی ممالک کے دارالاقامہ (بورڈنگ) الگ الگ ہوں جو انہی ممالک کی فیاضی سے تکمیل پائیں اور ان ممالک سے جو طلبا

تعلیم کے لیے بھیجے جائیں انہی دارالاقامہ میں قیام کریں۔زبان عام اورلباس سب کا عربی قرار دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔اس قسم کے امور میں ہر مسلمان رائے دے سکتا ہے اور مسلمانوں سے عموماً اور اہل الرائے حضرات سے خصوصاً اس کے متعلق رائے اور مشورہ طلب کیا جاسکتا ہے۔

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اصولی اور اہم امور کے متعلق عنوانات قائم کر دیے جائیں اوران کے متعلق اظہار رائے کی درخواست کی جائے۔چناں چہ اس غرض کے لیے چند عنوان درج ہیں:

۱۔مصارف کا سرسری تخمینہ۔

۲۔کیا اس غرض کے لیے حجاج پر ایک روپیہ فی کس اعانتی ٹیکس لگانا بہتر ہوگا جوترکی حکومت وصول کرے گی۔

۳۔سرمایہ مجتمعہ سے فائدہ اٹھانے کی کیا صورت ہوگی۔

۴۔جامعہ کی زمین شہر سے کس قدر فاصلہ پر ہونی چاہیے اوراس کی تخمینی مقدار کیا ہونی چاہیے۔

۵۔عمارت کا طرز اور اسلوب کیسا ہونا چاہیے۔کیا مختلف ممالک کے دارالاقامہ وہاں کے طرز تعمیر کے موافق ہوں؟

۶۔تعلیم کے شعبے کیا کیا ہوں گے؟

۷۔کیا کچھ مدت تک خاص بدووں کی تعلیم کا نصاب اور طریقہ جدا رکھنا ہوگا؟

۸۔کیا یہ مناسب ہوگا کہ صنعتی تعلیم (کسی نہ کسی قسم کی) ہر شعبہ کے لیے لازمی قرار دی جائے؟

۹۔علوم جدیدہ میں سے کسی شاخ کو لیا جائے یا بالکل احتراز کیا جائے؟

۱۰۔ ایک گروہ ایسا تیار کیا جائے جن کی معاشرت اور تربیت درویشوں اور

صوفیوں کی طرح پر ہو اور اس گروہ سے اشاعت اسلام کا کام لیا جائے۔

۱۱۔خاص خاص فنون میں کمال بہم پہنچانے کے [لیے] معقول وظیفے مقرر کیے جائیں جو ان طلبا کو دیے جائیں جو فارغ ہو کر جامعہ میں قیام کریں اور کسی خاص فن میں کمال بہم پہنچائیں جس کا امتحان بذریعہ تصنیف و تالیف کرانے کے لیا جائے۔

۱۲۔نصاب تعلیم میں قدما کی کتابیں زیادہ تر رکھی جائیں یا متاخرین کی؟

۱۳۔تعطیل کے زمانہ میں ہمیشہ ایک وفد تیار ہو جو بادیہ نشینوں میں جا کر ان کو تعلیم کی رغبت دلائے اور ان سے مل جل کر ان کی لغات و محاورات جدیدہ کی تدوین کرے۔

۱۴۔ چوں کہ بڑا مقصود، بدوؤں کو تعلیم دینا ہے اور وہ بغیر مالی توقع کے سردست تعلیم پر مائل نہیں ہو سکتے، اس لئے نہایت کثرت سے وظیفے مقرر کئے جائیں کہ بدووں کے لڑکے اس سے تعلیم پائیں۔ یہ ظاہر ہے کہ بدو، مصارفِ قیام وخورد و نوش برداشت نہیں کر سکتے۔

۱۵۔عربی زبان کے سوا اور کن کن زبانوں کی تعلیم دی جائے؟

۱۶۔ جس طرح ترکی گورنمنٹ اس یونیورسٹی کی سند کو تسلیم کرے گی اور اسلامی سلطنتوں اور ریاستوں سے بھی درخواست کی جائے کہ وہ بھی تسلیم کریں۔

۱۷۔ چوں کہ جو طلبا دور دراز سے جائیں گے وہ بڑی عمر کے ہوں گے اور ضرور ہے کہ وہ پہلے سے کچھ تعلیم حاصل کر چکے ہوں گے اس لئے ایسے طلبا کی تعلیم درجہ متوسط اور درجہ اعلیٰ پر محدود رکھی جائے اور اس کے داخلہ کے لئے کوئی امتحان مقرر کیا جائے۔ جو شخص اس امتحان میں کامیاب ہو وہ درجہ متوسط یا درجہ اعلیٰ میں داخل ہو سکے۔

۱۸۔تمام علوم وفنون میں جہاں تک ممکن ہو اصلی اور مقصود بالذات علوم مثلاً تفسیر، حدیث، اصول فقہ، فقہ، کلام وغیرہ کی تعلیم میں زیادہ صرف کیا جائے اور علوم

آلیہ بقدر ضرورت لئے جائیں۔

۱۹۔ یونیورسٹی کا ایک خاص مطبع ہو جس میں علاوہ کتابوں کے ایک ماہوار رسالہ عربی زبان میں شائع کیا جائے۔ یہ پرچہ محض علمی پرچہ ہو اور اس میں نہایت اعلیٰ درجہ کے مضامین علمی اور ادبی لکھے جائیں۔ اور زیادہ اس میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا مضامین لکھیں۔

۲۰۔ احکام مذہبی کی پابندی سختی سے کرائی جائے۔ کسی طالب کی نسبت اگر ثابت ہو کہ وہ ادائے فرائض میں سست اور لاپرواہ ہے تو ایک آدھ دفعہ تجربہ کر کے اس کو قطعاً مدرسہ سے خارج کر دیا جائے۔

شبلی نعمانی

۳۰ ر مئی ۱۹۱۳ء

بمبئی۔ نیونا گپاڑہ روڈ، اکبر بلڈنگ

---

[۲]

اختلاف ندوۃ العلماء

ندوہ میں علامہ شبلی کے خلاف جو طوفان برپا کیا گیا اور جس میں متعدد اخبارات بھی شامل ہو گئے تھے اس سلسلے میں علامہ شبلی نے کئی مراسلے لکھے ہیں جن کا ذکر ''مراسلات شبلی'' میں آ چکا ہے۔ اس سلسلہ کا ایک اور مراسلہ اخبار پیسہ لاہور کے ایڈیٹر مولوی محبوب عالم کے نام لکھا

گیا تھا جو ۲۳ /اپریل ۱۹۱۴ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔اس مراسلہ سے مسائل ندوہ کے علاوہ علامہ شبلی پر عائد کی گئی بعض تہمتوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو فرضی ناموں سے عائد کی جاتی تھیں۔ مراسلہ درج ذیل ہے:

جناب ایڈیٹر صاحب پیسہ اخبار دام لطفہ!

میرے متعلق جو تہمت آمیز خبریں (مثلاً رام پور وغیرہ میں ماہواریں بند کرانے کے لئے جانا) آپ کے اخبار میں شائع ہوتی ہیں اور پھر مجھ کو آپ مخاطب کرتے ہیں، ان کی نسبت کم از کم یہ دیکھ لیا کیجئے کہ وہ لوگ اپنا نام کیوں ظاہر نہیں کرتے اور اگر ہر گمنام تحریر کی بنا پر مجھ پر سوالات جاری کر دئے جائیں تو میں کہاں تک ان کے جواب کے لئے اپنا وقت صرف کر سکتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ قریباً نو مہینے سے ندوہ کی بے ضابطگیوں کے واقعات بعض معزز اخباروں میں مسلسل شائع ہوتے رہے۔ اسی زمانے میں ندوہ کے ایک ذمہ دار رکن (بابو نظام الدین) جن کو ندوہ کے جلسۂ انتظامیہ نے حسابات کے جانچنے پر مقرر کیا تھا، ان کی رپورٹ شائع ہوئی جس سے حسابات کے متعلق کچھ اچھی رائے نہیں قائم ہوتی۔ یہ بھی ان کی طرف سے شائع ہوا کہ تعمیرات کا حساب مطلق ان کو دکھلایا نہیں گیا۔ اس تقاضے پر بھی تعمیرات کا حساب اب تک شائع نہیں ہوا۔

چار مہینے سے زائد ہوئے سرکاری انسپکٹر مدارس نے ندوہ میں آ کر دارالعلوم کا معائنہ کیا اور نہایت مفصل رپورٹ لکھی۔ یہ رپورٹ پرنسپل صاحب اور مدرسین انگریزی نے دیکھی اور اس کے چرچے پھیلے۔ خود دفتر نظامت سے تمام ارکان کے نام، جن کی تعداد اکاون (۵۱) ہے، اس کا اقتباس بھیجا گیا جس میں یہ فقرہ تھا کہ ''اگر یہ ردی حالت

قائم رہی تو سرکاری اعانت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔'' ان واقعات اور عام خبروں سے اگر چہ ارکان نظامت متاثر نہیں ہوئے لیکن عام اثر کیوں کر رک سکتا تھا۔

میں حیدرآباد سے آتے ہوئے بھوپال ٹھہرا اور دو دفعہ حضور سرکار عالیہ کی خدمت میں حاضر ہوا، لیکن ندوہ کے متعلق میں نے ایک حرف بھی نہیں کہا۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ندوہ کی ماہوار میری ہی درخواست اور میرے اعتماد پر مقرر ہوئی تھی۔ آپ اس بات پر بھی غور فرمائیں کہ میری نسبت غلط خبریں شائع کرنے سے اصل معاملے پر کیا اثر پڑتا ہے۔ میں ہر طرح مجرم سہی لیکن اس سے ندوہ کی خوش انتظامی کیوں کر ثابت ہو سکتی ہے۔

آپ ایڈیٹر کی حیثیت سے قوم اور ملک کی زبان ہیں۔ آپ کو تھوڑا سا وقت اس کام کے لئے نکالنا چاہئے کہ آپ دفتر سے ندوہ کا دستور العمل منگوالیں جو صرف چند صفحات ہیں۔ انقلاب جدید میں جو انتظام کیا گیا، وہ دستور العمل کی رو سے کسی طرح جائز ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے اور کارروائیاں بے ضابطہ ہو رہی ہیں تو شخصی بحثوں سے قطع نظر کر کے اصل معاملے پر توجہ فرمائیے۔ میں آپ سے اور تمام خیر خواہان قوم سے استدعا کرتا ہوں کہ ندوہ کے مسئلے میں شخصیت، حیثیت اور پارٹی فیلنگ سے متاثر نہ ہوں۔

شبلی نعمانی

۱۷/اپریل ۱۹۱۴ء

باب ششم

منظومات

[۱]

مدح سرسید

اکتوبر ۱۸۸۱ء میں علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ اپنے منجھلے بیٹے مہدی حسن سے جو علی گڑھ کالج میں زیر تعلیم تھے ملنے گئے تو ساتھ میں علامہ شبلی کو بھی لے گئے۔ یہ علامہ شبلی کی سرسید احمد خاں سے پہلی ملاقات تھی چنانچہ علامہ شبلی نے ان کی شان میں درج ذیل قصیدہ پیش کیا جسے سرسید نے بہت پسند کیا اور اپنے اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ کے ۱۵/ اکتوبر ۱۸۸۱ء کے شمارہ میں شائع کیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے اسے حیات شبلی میں نقل کیا ہے اور اس کا ترجمہ بھی کر دیا ہے۔ یہ قصیدہ اور اس کا ترجمہ حیات شبلی میں سے نقل کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابتدائی دور میں علامہ شبلی عربی زبان سے کس درجہ شغف رکھتے تھے۔

المجد یصحب علما حیثما یصل   والعلم عن قومنا لازال یرتحل

''بزرگی جہاں جہاں جاتی ہے، علم کو بھی ساتھ لے جاتی ہے، حالاں کہ علم ہماری قوم سے رخصت ہو رہا ہے۔''

نالوا من الذّل ما لا ناله احد   اذ لا یری فیهم علم و لا عمل

''ہماری قوم کو وہ ذلت حاصل ہے جو کسی کو حاصل نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ ان میں نہ علم نظر آتا نہ عمل۔''

ولا تزال تری ینشتُّ شملهُم　　فی کُلِّ یومٍ و قد ضاقت بهم حیل

''ان کا شیرازہ برابر بکھر رہا ہے اور ان کے لئے تمام راستے بند ہو گئے ہیں۔''

لا یرغبون الی ما کان ینفعهم　　فجلّ صنُعتهم للغی و الخطل

''مفید چیزوں کی طرف ان کا میلان بھی نہیں ہے، ان کا تمام تر کارنامہ گمراہی اور پریشان رائی ہے۔''

تراهم الیوم فی کابٍ و فی قلقٍ　　فلا افاد فتیلا ما به اشتغلوا

''آج تم ان کو رنج و غم میں مبتلا دیکھ رہے ہو ان کے مشاغل نے ان کو ذرّہ بھر بھی فائدہ نہیں پہنچایا۔''

لا ینتهون و قد ذاقوا وبالهم　　عن سوء صنعٍ فقد باؤا بما عملوا

''باوجودیکہ اپنی بداعمالیوں کا مزہ چکھ چکے لیکن ان سے باز نہیں آتے، نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے اعمال کا خمیازہ اٹھا رہے ہیں۔

وهل یجازیهم الا بما اکتسبوا　　من کان عنده الاحکام تنفصل

''خدا جو معاملات کا فیصلہ کرتا ہے کیا اس کے سوا ان کو اور کوئی معاوضہ دے سکتا تھا۔''

فمن سعی الیوم فی اصلاح حالهم　　فا اللّٰهُ جازیه یوم یقطع الامل

''پس جس شخص نے ان کی اصلاح کے لئے کوشش کی، خدا اس کو قیامت میں صلہ دے گا۔''

ان کنت تسئلنی من هذه صفته　　قلت الامام الهمام السید البطل

''اگر تم مجھ سے پوچھو وہ کون ہے؟ تو میں کہوں گا، امام سردار، بہادر، سید۔''

هو الَّذی فاق فی الآفاق منزلةً ونال مالم تنله الاعصر الاُول

''وہ وہ ہے کہ تمام ملک میں بلند رتبہ ہوا، اور وہ بات حاصل کی جو قدما کو بھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔''

من اقبل الدین والدّنیا علیه معا والآن فی نجعٍ ما قد رام مشتغلٌ

''جس کو ایک ساتھ دین و دنیا دونوں ملے اور اب تک اپنے مقاصد کی کامیابی میں مشغول ہے۔''

نال المکارم من آبائه و مشیٰ فی المکرمات علی آثار ما فعلوا

''اس کے دادا عرب وعجم کے سردار تھے، اور ان کی موت کا وقت آیا تو صرف امتی کا لفظ ان کی زبان سے نکلا۔''

وهٰکذا صُنُعُ هٰذا السید العلم یقول یا لهف قومی یسی ء ما عملوا

''اسی طرح اس نامور سید نے کہا کہ افسوس میری قوم نے جو کچھ کیا، برا کیا۔''

یاخیر من سیط حب القوم من دمه احسِن ولا تبتئس من سوء ما عملوا

''اے ان لوگوں میں بہتر جن کے خون میں قوم کی محبت پیوست ہوگئی ہے، عمدہ کام کر اور جو برائیاں قوم نے کیں، ان سے غم زدہ نہ ہو۔''

اَحْسِنُ الیهمُ ولو جازوک سیّئةً ولا تبال بما قالوا و ما فعلوا

''ان کے ساتھ احسان کر، گو وہ تیرے ساتھ برائی کریں اور جو کچھ وہ کہیں اور جو کچھ کریں اس کی پروانہ کر۔''

(حیات شبلی۔ ص ۱۷۱-۱۷۳)

[۲]

قصیدہ خلیفہ سید محمد حسن کی خدمت میں

''خلیفہ سید محمد حسن وزیر ریاست پٹیالہ ۱۵؍مارچ ۱۸۸۶ء کو ایم اے او کالج علی گڑھ تشریف لائے۔ ان کی آمد پر کالج میں متعدد پروگرام ہوئے۔ جلسہ دعوت میں وزیر موصوف کی تقریر کے بعد علامہ شبلی نے اپنا قصیدہ پیش کیا۔ یہ قصیدہ کلیات شبلی فارسی میں شامل نہیں ہے۔ دو برس پہلے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ورق گردانی کے دوران دارالمصنّفین کے ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کو دستیاب ہوا، انہوں نے اس نادر قصیدہ کو اپنے نوٹ کے ساتھ معارف اپریل ۲۰۱۵ء میں شائع کیا ہے۔

اے دل ایں مایہ انتظار کہ بود　　آخر ایں سستی از خمار کہ بود
چشم شوقت بہ انتظار کہ بود　　ہوسِ سرمہ غبار کہ بود
ایں بہ بیں خانہ جلوہ گاہ کہ ہست
پردہِ دیدہ فرشِ راہ کہ ہست
اے گراں مایہ سرور ممتاز　　آنکہ زو ملک و دیں گرفتہ طراز
آں محیط کرم کہ از آغاز　　قوم را بودہ است چارہ ساز

فکر تیمار شاں مقدم داشت
گر غمے داشتست ایں غم داشت

قوم را دید جاں بہ لب گشتہ خستہ منزل طلب گشتہ
مبتلائے غم و تعب گشتہ روز او تیرہ تر زشب گشتہ

حال شاں (چوں) تباہ وخوار نخواست
ہم از اول بیاوری برخاست

یاد روزے کہ ایں بناء متیں رفعت و اوجِ او نبود چنیں
در و بامش نداشت ایں تزئین خاتمے بود و خود نداشت نگیں

ثمرے بود نارسیدہ ہنوز
غنچۂ بود نودمیدہ ہنوز

ہم دراں روزہا بلطف و کرم کردۂ ایں اساس را محکم
قوم وارستہ شد ز بند الم خستگاں را نواختی مرہم

آں کہ طرح وفا نہاد توئی
آں کہ دادِ کرم بداد توئی

اینک آں قطرہ گوہر است بہ بیں ذرہ خورشید انور است بہ بیں
خود ہماں حرف دفتر است بہ بیں شوکت و شان دیگر است بہ بیں

ہمت قوم چوں بہ کار آمد
اینک ایں باغ را بہار آمد

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۳/ مارچ ۱۸۸۶ء)

[۳]

قصیدہ بخدمت نواب آسماں جاہ

''جولائی ۱۸۸۸ء میں سرآسمان جاہ مدارالمہام سرکار نظام حیدرآباد دکن ایم اے او کالج علی گڑھ کے معائنہ کے لئے تشریف لائے۔ کالج کمیٹی کی طرف سے علامہ شبلی نے ان کی خدمت میں فارسی زبان میں یہ قصیدہ پیش کیا۔ یہ قصیدہ سرسید احمد خاں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۴ر جولائی ۱۸۸۸ء میں شائع کیا ہے جسے سوا سو سال بعد پروفیسر اشتیاق احمد ظلی مدیر معارف نے دریافت کیا اور بڑے اہتمام سے معارف مئی ۲۰۱۵ء میں شائع کیا ہے۔ یہ قصیدہ بھی کلیات شبلی فارسی میں شامل نہیں۔

مژدہ ام در گوشِ جاں آید ہمی   کہ اینک آں صدرِ زماں آید ہمی
تاکند سیراب کشتِ آرزو   ابر رحمت در فشاں آید ہمی
آں کہ چشم ما براہم بودہ است   خود ہماں دولت فشاں آید ہمی
ہم چناں باشیم گرمِ گفتگو   قاصد از در ناگہاں آید ہمی
افگند شور مبارکباد و پس   ایں حدیثش بر زباں آید ہمی
آسماں جاہ از سوئے ملک دکن   جانب ہندوستان آید ہمی

فتح و نصرت در رکابش می دود　　بخت و دولت ہم عناں آید ہمی
گرد راہ او بچشم انتظار　　سرمہ کز اصفہاں آید ہمی
از قدوم او بہر بزم سخن　　داستاں در داستاں آید ہمی
لطف عامش بیں کہ با ایں اوج و جاہ　　بزم ما را میہماں آید ہمی
اے کہ نبود جز سپاس و شکر تو　　ہرچہ ما را بر زباں آید ہمی
عذرِ ما نہ کہ زمہرت دم زنیم　　رازِ الفت خود عیاں آید ہمی
ایں کہ می گویم نہ از مدح و ثنا است　　شکر نعمت بر زباں آید ہمی
قوم را برگشتہ شد چوں روزگار　　دیں سخن بر دل گراں آید ہمی
کارِ شاں آخر بداں خواری کشید　　کاں نہ در وہم و گماں آید ہمی
طرح ایں بیت العلوم انداختند　　تا مگر بوئے اماں آید ہمی
تا مگر دل خستگانِ قوم را　　چارہ درد نہاں آید ہمی
پس زیاراں یاوری درخواستند　　تا ازاں مقصد نشاں آید ہمی
روز اول ہم ز سرکارِ نظام　　آں کہ نامش حرز جاں آید ہمی
تاچہ بخششہائے گوناگوں رسید　　کاں نہ در شرح و بیاں آید ہمی
ہم سپاس تو بجا آریم ما　　کز تو لطفِ بے کراں آید ہمی
ہم از فیضِ تست کہ ایں قصر رفیع　　ایں چنیں بازیب و شاں آید ہمی
اخترِ اقبال تو تابندہ باد　　بر دعا ختمِ بیاں آید ہمی

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۴؍جولائی ۱۸۸۸ء)

[۴]

قصیدہ بخدمت مسٹر جوزف بک

مسٹر جوزف بک علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر بک کے والد تھے۔ وہ ۱۸۸۸ء میں علی گڑھ تشریف لائے۔ ان کے اعزاز میں متعدد جلسے اور دعوتیں ہوئیں۔ ایک دعوت میں علامہ شبلی بھی شریک تھے، اس میں انہوں نے ایک قصیدہ پیش کیا۔ یہ قصیدہ کلیات شبلی فارسی میں شامل نہیں ہے۔ اسے منشی امین زبیری نے ذکر شبلی ص ۶۸ میں درج کیا ہے۔

چنیں باشد چو دولت یار و طالع ساز گار آید — کہ جوزف بک بہ مہمانی کالج زاں دیار آید

بہ ہر سو جلوۂ رنگ مسرت را تماشا کن — کہ جوزف بک بسیرِ ہند با خویش و تبار آید

زمیں از عکس رنگ موکبش در جلوہ پیرائی — چناں باشد کہ در صحرا بہارِ لالہ زار آید

زہے مجموعۂ اخلاق حسن صؤرت و سیرت — کہ رنگیں از نگارش در نظر گل در بہار آید

تنم بر خویش می بالد دلم بر خود ہمی جوشد — کہ ہم چو صاحبے ممدؤح را بر ما گزار آید

زیمن مقدمش ترتیب دارم بزم تو امشب — عروس آسا کہ در پیرایش نقش و نگار آید

خوشا ترتیب بزم آرائی ایں جلسۂ رنگیں — کہ حسنِ اتحادِ ہم دگر بر روے کار آید

بہ یک سو میزباں را میہماں در پہلوئے الفت — بہ یک سو میہماں را میزباں اندر کنار آید

تو گوئی خانۂ امشب صحنِ اشجار مسرت شد — کہ پیدا از در و دیوار شاخِ برگ و بار آید

زفر مقدمش گیرد بنائے کالج اعزازے　　　که قصرِ اعتبار قومِ ما زیں استوار آید
کنوں مرافسران کالج و اسکول را حاصل　　　زتشریفِ قدومش صد وقار اندر وقار آید
مسلسل رشتۂ نظمم باامواج گہر ماند　　　که ہر بیتم ز وصفِ سلکِ دُرِّ شاہوار آید
سخن دل چسپ رنگیں تر ولیکن مختصر گفتم　　　که خوبی در سخن حاصل زلطفِ اختصار آید
ترا اقبال و جاہ و حشمت از ہر سو فرا گیرد　　　گہے اندر یمیں باشد گہے اندر یسار آید

ہمیشہ وشمنانت را بہ ساغر زہرِ ناکامی
ترا دائم می نابِ مسرت خوش گوار آید

[۵]

قصیدہ بخدمت مدارالمہام حیدرآباددکن

اسی طرح اقبال الدولہ، وقارالامرا، مدارالمہام حیدرآباددکن کی آمد پر علامہ شبلی نے ایک بڑا پرزور قصیدہ لکھا، جس میں ''مسلمانوں کے ادبار، علی گڈھ تحریک اور کالج کی خصوصیات'' کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے یہ پورا قصیدہ حیات شبلی کے ایک حاشیہ میں درج کیا ہے۔ یہ بھی کلیات میں شامل نہیں ہے۔

در جہاں چوں سخن از شوکت و از شاں گذرد — نام دستور دکن بر سر عنواں گذرد
صدر جم مرتبہ نواب وقار الامراء — آں کہ گردوں بدرش بندۂ فرماں گذرد
اے خوشا بخت کہ آں داور جمشید حشم — بسر مدرسہ با ایں سر و ساماں گذرد
ایں دبستاں بہ مثل تازہ گلستانے ہست — خواجہ ابریست کہ برطرف گلستاں گذرد
گذر افتادہ ہما کوکبہ جاہش را — تشنہ بنگر کہ برو چشمۂ حیواں گذرد
ابر دیدی کہ گہر ریز رود بر سر خاک — موکب خواجہ بہ ما نیز بدینساں گذرد
بہ مثل واقعۂ مور و سلیماں باشد — گر حدیث از شرف و پایہ مہماں گذرد
دادرا مدح تو اندازہ مانیست ولے — خوش بود گر سخن از عالم احساں گذرد
یادگار کرم دولت آصف جاہی است — بہ نظر ہر چہ دریں منزل و ایواں گذرد

میوزیم کو شرف نسبت نامش دارد — جائے آنست کہ از طارم کیواں گذرد
خاص وعامی ہمہ ازفیض کفش سیراب اند — ابرہم بر چمن و ہم بہ بیاباں گذرد
صاحبا! گوش بہ من دار کہ تا شرح دہم — آں چہ بر ما زسیہ کاری دوراں گذرد
بود روزے کہ گراں پایگی رتبۂ ما — بیش ازاں بود کہ در وہم سخن داں گذرد
حالیا کار بآں بے سر و پائی بہ کشید — کہ بہ ما ہر کہ رسد برزدہ داماں گذرد
بگذرد از غم و آزار پیاپے بر ما — انچہ بر شیشہ ز اوفتادن سنداں گذرد
ہر چہ از بےکسی و ذلت وخواری بینی — خودعیاں است ومپرس آں کہ بہ پنہاں گذرد
گرنہ ایں مکتب وایں مدرسہ برپا می گشت — بیم آں بود کہ ایں درد ز درماں گذرد
ایں مسیحا نہ اگر بہر مداوا می خواست — بیم آں بود کہ رنجور خود از جاں گذرد
بہ رسد بر در او ہر کہ بود طالب فن — آنکہ گوہر طلبد جانب عماں گذرد
گر بدیں گونہ بود گرمی ہنگامہ او — خود زغرناطہ و بغداد و صفاہاں گذرد
ہر دم ایں مدرسہ لاریب گہر می گردد — اند کے باش کہ ایں قطرہ گہر می گردد
تا خود از دانش وفن نام ونشاں خواہد بود — جوئے ایں فیض بدیں گونہ رواں خواہد بود
تا ابد طالب فن روے بدو خواہد کرد — تا ابد قبلہ دانش طلباں خواہد بود
گر بدیں گو نہ بود مائدہ فیض دراز — یک جہاں زلّہ ربائے سرخواں خواہد بود
دوست افسانہ شادی بزباں خواہد راند — خصم را دیدہ حیرت نگراں خواہد بود
ہست چوں درکف قیصر ودارائے دکن — ایمن از فتنہ و آسیب زماں خواہد بود
ملک وملت ہدف تیرحوادث بودہ است — آستانش حرم امن و اماں خواہد بود
آرزوہاست دراندیشہ وازفضل خدائے — انچہ اندیشہ نمودیم ھماں خواہد بود
گر بہ آئین سلف بہرہ ربائیم زعلم — رخش اقبال دگر در تہ راں خواہد بود
باز در راہ طلب گرم بخیزیم ز جائے — خواب دوشینۂ ما چند گراں خواہد بود

می تواں غلغلہ اوج و ترقی انگیخت — تا یکے برلب ما آہ و فغاں خواہد بود
بود آں ہم کہ بہ ما نیز گہے یار شود — چرخ تا چند بکام دگراں خواہد بود
ہاں بسنجی کہ نژاد عرب و آل لوے — ایں چنیں خستہ ورسوائے جہاں خواہد بود
آں چمن زار کہ پروردہ ابر کرم است — ہاں میندیش کہ تاراج خزاں خواہد بود
بس بود ایں کہ نہ داریم سر تاج و کلاہ — بخت زیں بیش چہ درفکر زماں خواہد بود
با ہمہ خستگی آں فطرت آبا باقی است — خاک گشتیم وہنوز آں سر وسودا باقی است

---

[۶]

تقریظ مثنوی شمامہ مشام افروز

ہماری ادبی تاریخ میں منظوم تقریظ اور دیباچوں کا ایک عرصہ تک رواج رہا ہے۔ علامہ شبلی نے خود اپنی کتابوں سیرۃ النعمان اور الفاروق پر منظوم دیباچے لکھے جو کلیات میں شامل ہیں۔ انہوں نے حکیم عبدالرحمٰن حیرت جھنجھانوی [۱۸۲۸-۱۸۸۶ء] کی مثنوی شمامہ مشام افروز [مطبع تہذب آفاق مراد آباد۔۱۳۰۳ھ] پر بھی منظوم تقریظ لکھی ہے۔ یہ ان کی اب تک کی دستیاب واحد منظوم تقریظ ہے۔

اے کہ نقد ہنرے می خواہی　　نخل فن را ثمرے می خواہی
اے وایں نامہ زیبا بنگر　　نو عروسے ست تماشا بنگر
ثانیش نیست زانباز مگوی　　طرز او بین وزاعجاز مگوی
بیش ازیں اوج ہنر تاچہ بود　　سخن ایں ست دگر تاچہ بود
لفظ را شمع تجلی بنگر　　واں تنو مندی معنی بنگر
عبدرحمں کہ جہان معنی ست　　شاعر مرتبہ دان معنی ست
سخنے گفت وچہ خوش گفت نگر　　خامہ اش تاچہ گہر سفت نگر
بردہ است از مدد فکرِ رسا　　پایہ فن زکجا تابہ کجا

نظم اشعار چہ آراستہ است	زلف گفتار چہ آراستہ است
نثر او ہیچ کم از پرویں نیست	علم و فن رابہ ازیں آئیں نیست
غیر ازو کیست کہ با طبع بلند	صید معنی ہمہ آرد در بند
بہ ازیں گر روشے جوئے نیست	ساحری ہست و سخن گوئی نیست
مدح او درسخنے کے آید	آخر از ہم چومنے کے آید
چوں باوجش نہ رسید پیک خیال	تاچہ آید زمن بے پر و بال
تو اگر فکرِ رسائے داری	ناخنے عقدہ کشائے داری
بنگر ایں نامہ کہ خود دریابی	ہمہ گنجینہ گوہر یابی
من ناشاد چہ دیگر گویم	تا ابد باد چہ دیگر گویم

(شامہ مشام افروز۔ص۱۳۱)

[۷]

اے دکن

یہ نظم کلیات شبلی فارسی میں شامل نہیں ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کو علامہ شبلی کے کاغذات میں یہ ناتمام نظم ملی تو انہوں نے ''باقیات صالحات ترکان عثمانی'' کے نام سے جنوری ۱۹۲۵ء میں شائع کیا، لیکن یہ نظم حیدر آباد میں لکھی اور پڑھی گئی تھی اس لئے حیدر آبادی اہل علم نے اس کی نشاندہی کی اور مکمل نظم ارسال کی چنانچہ سید صاحب نے اپنے ایک طویل نوٹ کے ساتھ اسے معارف اکتوبر ۱۹۲۵ء میں شائع کیا۔ یہ نظم آج بھی کلیات میں شامل نہیں ہے۔

اے دکن ایکہ جہان را سر و سودا باتست — اے کہ مجموعۂ صد یاس و تمنا باتست
اے کہ صد نقش ز ہر پردہ بر انگیختۂ — اے کہ صد جلوہ گری ہائے تماشا باتست
زاہد استی کہ سر صدق و صفا ہست ترا — شاہد استی کہ دلآویز اداہا باتست
ساز نیرنگی و صد نغمۂ رنگین داری — لوح ارژنگی و صد پیکر زیبا باتست
یادگارِ چشم دیلم و سلجوق استی — مایۂ دولت بغداد و بخارا باتست
داستان ہائے عزیزان ہمہ از برداری — خبر از قافلۂ یثرب و بطحا باتست
آن پراگندہ نژاد عرب و نسلِ عجم — یعنی آن دفتر اسلام مجزا باتست

گرچہ شیرازۂ امت ہمہ ابتر شدہ است — اُن ورق ہائے پراگندہ بیک جا باتست
گرچہ زان میکدہ اکنون اثری نیست بجائے — جرعۂ چند از ان شیشۂ و مینا باتست
گرچہ آن تازہ چمن رفت بتاراج خزان — باز ہم بوئے خوشی زان گل رعنا باتست
گرمی صحبت آن میکدہ سر جوش تو ہست — مصر و غرناطۂ و بغداد در آغوش تو ہست
اے بزرگان گراں پایہ دار دکن — اے ہمہ شمع فروزندۂ ایوان دکن
ہر سر موئے من امروز زبانے شدہ است — بسپاس آوری منت اعیان دکن
پائے تا سر ہمہ در بند کرم ہائے شماست — می تو ان خواندنم از جملہ اسیران دکن
با غریبے چو منے ایں ہمہ الطاف و کرم — چہ کنم گر نشوم بندۂ احسان دکن
ہم زگیرائی اخلاق دلآویز بود — کہ بود رومی و شامی ہمہ مہمان دکن
بوئے خلق است کہ دل می بردم ورزمرا — نتواند کہ فریبد گل و ریحان دکن
یارب آں باد کہ ایں تخت گہِ دولت و دیں — سبز و خرم بود از فیض سلیمان دکن
میر محبوب علی خان نظام آصف جاہ — تاجدار دکن و قیصر و خاقان دکن
صدر جم مرتبہ نواب وقارالامراء — آنکہ صد پایہ فزود از شرفش شان دکن
واں دگر صدر نشینان و عزیزان وطن — کہ بود دام دمِ شان زینت ایوان دکن

ہمہ را بزم طرب با سر و سامان باشد
شبلیؔ خستہ ہم از حاشیہ بوسان باشد

[۸]

مرثیہ

علامہ شبلی علی گڑھ کالج سے فروری ۱۸۸۳ء میں وابستہ ہوئے۔اسی ماہ فروری میں حیدرآباد دکن کے مدارالمہام سرسالار جنگ نے انتقال کیا۔وہ کالج کے خاص محسنوں میں تھے۔چنانچہ اظہارغم کے لئے ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔علامہ شبلی نے اس حادثہ پر ایک مرثیہ لکھا اورجلسہ تعزیت میں پڑھ کر سنایا۔یہ مرثیہ حیات شبلی میں درج ہے،لیکن کلیات میں شامل نہیں۔مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ شبلی کے مخصوص انداز سے اس کا رنگ ہلکا ہے۔یہ ممکن ہے اس لئے کہ یہ علامہ شبلی کی علی گڑھ میں پہلی تخلیق ہے جو کہ جلسہ میں پیش کی گئی۔

آہ ایں چہ غم بود کہ جہانے است نوحہ گر　　ایں آہ چہ ماتم است کہ خوں شد دل وجگر
تنہا ہمیں نہ دولت و ملک است درخطر　　ہم شرع را نماند کنوں معنی دگر
سالار جنگ مرد جہاں گشت دیدہ تر　　شادی ز دل رمیدہ و دل زاں رمیدہ تر
ہم ملک را پناہ و ہم اسلام را مدار　　کز یمن او نظام ریاست شد استوار
آئین و رسم و داد ازو بود برقرار　　بیداد بیں کہ گردش چرخ ستم شعار
آں را کنوں بخاک برابر گرفتہ است　　ہر کس چو شمع ز آتش غم در گرفتہ است

آں کو فلک بہ در گہ او سر نہادہ است
افسر بہ فرق خود ز مہ و خور نہادہ است

چرخش کنوں بخاک برابر نہادہ است
طرح جفائے تازہ ستمگر نہادہ است

تا ایں خبر بکوچہ و برزن فتادہ است
کار جہاں بنالہ وشیون فتادہ است

ایں سرورے کہ مثل نبودش کسے بدہر
آئینہ دار طلعت او بودہ ماہ و مہر

ہم دانشش نصیب وہم از داوریش بہر
شاہے چنیں نگر کہ بہ یک جنبش سپہر

در تنگ نائے تیرہ مغاک آرمیدہ است
خورشید زیر پردہ خاک آرمیدہ است

امروز فرد در ہمہ کشور جز او کہ بود
پشت و پناہ شرع پیمبر جز او کہ بود

زیب و طراز مسند افسر جز او کہ بود
باآسماں بجاہ برادر جز او کہ بود

اکنوں اگر کنارہ ازیں خاکداں گرفت
آوازہ اش محیط زمیں و زماں گرفت

آں کس کہ بود دولت و دیں در پناہ او
آں کس کہ آسماں نہ رسیدے بجاہ او

اکنوں کہ گشت خلد بریں جلوہ گاہ او
رحم است بر ریاست و روز سیاہ او

مرگ کسے کہ ثانی و ہمتا نہ داشتست
دردے کہ بود ہیچ مداوا نہ داشتست

آں داور جہاں کہ بہ دانش یگانہ بود
پاکیزہ مشربے کہ بہ عالم فسانہ بود

فرزانہ مہترے کہ مثل در زمانہ بود
تا بنگریم تیر اجل را نشانہ بود

خار است اینکہ بر ہمہ را در جگر نشست
بارغم است اینکہ فلک را کمر شکست

در رفتنش اگر چہ جہانے بجاں بود
اما ہر اُنچہ خواستۂ آسماں بود

باشد ہماں چہ سود بود چہ زیاں بود
اکنوں دعائے شبلی دل خستہ آں بود

کورا بود بہ رحمت پروردگار جائے
خود زیر سایہ حرم کردگار جائے

[۹]

تاریخی مادے

علامہ شبلی نے بعض تاریخی مادے بھی نکالے ہیں، جو مکاتیب میں موجود ہیں۔ راجندر جو غالبًا گھر کا ملازم تھا اس نے انتقال کیا تو علامہ کے منجھلے بھائی مہدی حسن بیرسٹرایٹ لا کی خواہش پر درج ذیل تاریخ وفات لکھی۔

---

[۱]

چو راجندر پرشاد در خاک خفت — کہ غافل ز پیچ وخم مرگ بود
مرا بود سرمایہ زندگی — وفا بامنش تا دم مرگ بود
جہانے ز مرگش غمیں شد بہ بیں — کہ ہم سال مرگش غم مرگ بود

۱۳۰۰ھ

....

[۲]

آں گراں پایہ یارمن راجندر — از جہان رفت وزیرخاک نہفت
خویشتن از میاں رمید و مرا — خان و ماں شکیب پاک برفت
چارہ چوں نیست جز شکیبائی — خود چہ آید کنوں زگفت وشنفت

از سر وصل او تواں بگذشت　　گرچہ ایں حرف خود نیارم گفت
وانگہے سال مرگ او گفتم　　کافتابی بہ زیر خاک نہفت
۱۸۸۳ء　　۱۸۸۹ء

....

[۳]

مرحبا مرحبا لمولود　　کہ بود بادہ ایاغ کمال
باز در پیش گاہ بزم وجود　　گشت روشن ازو چراغ کمال
مردم دیدہ ہنر فرحت　　کہ تواں یافت زو سراغ کمال
سال تاریخ را چو امر نمود　　گفت شبلی بہار باغ کمال
۱۳۲۰ھ

[۱۰]

الوداعی نظم

عطیہ بیگم یورپ گئیں تو ان کو وداعی نظم ''خدا حافظ'' بھیجی جو
خطوطِ شبلی میں مکمل موجود ہے اور کلیات میں شامل نہیں۔

اے کہ دل بر سفر نہادستی زود ازیں منزل دراز آئی
ہم بصد جاہ و احتشام روی ہم بصد گونہ عز و ناز آئی
می روی گرچہ با سرو ساماں بیش ازیں ہم بہ برگ و ساز آئی
بروی سوے پیرس و لندن و زرہِ کعبہ و حجاز آئی
رسم و آئینِ شرع نہ گذاری رہ رو جادۂ نیاز آئی
نکتہ پیراے علم و فن باشی تا بہر پایہ سرفراز آئی
دوستاں دیدہ بر رہت باشندہ کہ تو ناگہ زدر فراز آئی
بہ سفر رفتنت مبارک باد بہ سلامت روی و باز آئی
و زپس آمدن بہ اعظم گڑھ
از رہ لطف یکہ تاز آئی
اے کہ دل بر سفر نہادستی زود ازیں منزل دراز آئی
ہم بصد جاہ و احتشام روی ہم بصد گو نہ عز و ناز آئی

عطیہ فیضی کے نام دو اور قطعے بہ شکل غزل خطوط شبلی میں ہیں

[۱]

نسیم صبح بیاؤ بہ مردم پیش آئے   پیام بندہ بہ آں خاک آستاں برساں
وفورِ شوق شکیبانہ می تو اند شد   روا مدار در رنگ و ہمیں زباں برساں
متاع جان دہم ار پاے مزدمی خواہی   وگرنہ لطف بفرمائے ورایگاں برساں
حدیث شوق نہ چنداں کہ درمیاں گنجد   ہر انچہ می بتوانی ازاں میاں برساں
تصرفے مکن از پیش خود درو چیزے   چنانکہ با تو بگویم تو ہم چناں برساں
بہ آستانۂ او سرنہ وز روے ادب   درود گوئی و دعایم زماں زماں برساں
بگو زمن کہ بہ اعظم گڑھ آمدن گفتی   بیاؤ مرتبۂ من بہ آسماں برساں
سلام شوق و دعائے بقائے دولت وجاہ   بہ نازلی و بہ زہرا یگاں یگاں برساں

....

[۲]

شوق تو از کجا بہ کجا می برد مرا   نزدیک شد کہ گردِ رہ کارواں شوم
تا بمبئی رسیدہ ام و زود تر بود   کز بمبئی بہ سوئے جزیرہ رواں شوم

یہ دونوں قطعات کلیات میں شامل نہیں۔

[۱۱]

بندول

اپنے جائے تولد موضع بندول کی شان میں چند اشعار کہے ہیں جو جابہ جامل گئے اور کلیات میں شامل نہیں ہیں۔

فضل بندول اگر تو نہ شناسی　　آدمی نیستی تو نسناسی
نہ تواں یافت ہیچ جائے چو او　　خرم و سبز و دلکشائے چو او
ہست از غایت فرح بسرشت　　مرغزارے مگر زباغ بہشت

(حیات شبلی۔ص۱۲۰)

[۱۲]

غزلیں

(فارسی)

مولانا شبلی کی مندرجہ ذیل غزل غنچہ جاوید جلد۲ نمبر۷ بابت ماہ دسمبر ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ ان کے مجموعہ ہائے کلام دیوان شبلی، بوئے گل، دستۂ گل، برگ گل اور کلیات شبلی میں شامل نہیں ہے۔

(قاضی افضل حق قرشی)

---

[۱]

راہے دگر بغیر حریم حرم نداشت　　زاہد کہ تاب جلوۂ روی صنم نداشت
عرض متاع درد نمودیم ما وغیر　　مسکین ہنوز مایۂ یک چشم نم نداشت
وحشی دلم بہ سایۂ زلفِ دراز او　　جا کرد، وآرمیدہ و بیا سود ورم نداشت
صد چشمہ جوش میزند اینک زدیدہ ام　　آں نیز بودہ است کہ ایں خانہ نم نداشت
از بسکہ دل ربود، گراں بار گشتہ است　　زیں پیش ورنہ زلف تو ایں مایہ خم نداشت
مارا بہ بوسہ ہائے شکر ریز برنواخت　　تا کس نگوید اینکہ طریق کرم نداشت
دل را بہ ہر کہ عرضہ نمودیم در جہاں　　انصاف داد و گفت کہ ایں جام جم نداشت

گنجینۂ متاعِ شبِ وصلِ یارا کردم شمار وشکر کہ یک بوسہ کم نداشت
شبلی زخیل زمزمہ سنجان حشم گرفت
بآں کہ ہیچ گونہ زخیل وحشم نداشت
(ادبی دنیالاہور۔نومبردسمبر۱۹۶۶ء۔ص۱۵)

ان کے علاوہ عطیہ فیضی کی بہن زہرا بیگم کے نام کے خطوط
میں بھی کئی قطعات اورغزلیں ہیں جوکلیات میں جگہ نہ پاسکیں۔مثلاً

[۲]

دی یکے گفت کہ در ریختہ انشائے سخن شیوۂ ہست کہ مخصوص زباں داں باشد
گفتم البتہ چنین است کہ گفتی ، اما نیست چیزے کہ بروں ازحدامکاں باشد
مرد دانا بتواند کہ بہ تحصیل وبہ سعی باعرب حرف زند گرچہ زایراں باشد
مادریں حرف کہ پیکے برسانید بہ من نامہ را کہ گراں قدر تراز جاں باشد
نامہ وا کردہ بہ دستش بسپردم کہ بہ من ایں چنیں حرف بہ اردوزدن آسان باشد
نامہ راخواندوبفرمود کہ شک نیست دریں کایں چنیں حرف زدن کارزباں داں باشد
کہ بودصاحب ایں نامہ واصلش زکجااست اعتبارِ گہر از فرخیِ کاں باشد
گفتمش ریختۂ خامۂ زہرا است ایں کز دکن ہست ومرا ہمچوعزیزاں باشد
یارب آں دست وقلم درکنفِ حفظ توباد تا جہاں باشد و تا گنبد گرداں باشد

....

[۳]

بود بست وششم وسیزده صداز ہجرت — کہ بزد نقش دگر بختِ ستم گارۂ ما
مہرباں مادرِ ما ، سایہ زما باز گرفت — آں ہمایوں نفس،آں مونس وغم خوارۂ ما
آنکہ بازیگہ ما بود کنار و دستش — آنکہ کرد از رگ جاں رشتۂ گہوارۂ ما
آہ از ان مہر ومحبت کہ بدش می نامد — گر کسے گفت فلاں ہست پرستارۂ ما
خانۂ دولت ما تیرہ تراز شب گشتہ است — تابرفت آن ششمِ سبعۂ سیارۂ ما
مادرا تابچہ حالی کہ نداری خبرے — زانچہ بگذشت بہ ما و دل صد پارۂ ما
خود ہماں غازۂ رنگیں کہ بہ رویم بستی — حالیا گرد یتیمے ست بہ رخسارۂ ما
اختر و مہر و مہ و چرخ ہمہ درکار ند — لیک کس مے نتواند کہ کند چارۂ ما
دہر، ہر چند کہ آراستہ بزمی است ولے — بے تو با ہیچ نسازد دل آوارۂ ما
تانہ بینی کہ فراق تو چہا کرد بہ ما — گاہے از خلد بروں آے بہ نظارۂ ما
بہر ما مرگ پدر،مرگ نخستیں بودہ است — چوں روا داشتی ؟ ایں مرگ دگر بارۂ ما
شبلی ایں مرثیہ گفتم ز زبانِ زہرا — آنکہ صد لطف میاں داشتہ دربارۂ ما

....

[۴]

مشغول کار مدرسہ بودم کہ ناگہاں — دیدم کہ نامہ ہا زپئے ہم رسیدہ است
زاں جملہ ہست نامۂ بےنقش وبےسواد — کز بارگاہ حضرت بیگم رسیدہ است
از جاے جستم وبگرفتم بدست شوق — گویا کہ خستہ ایست بہ مرہم رسیدہ است
بر سر نہادم و بہ ادب بوسہ دادمش — مانند تشنہ کہ بہ زمزم رسیدہ است
مہر از سرش گرفتم و از جا در آمدم — چوں دیدم ایں کہ کاغذ زرہم رسیدہ است

....

[۵]

نازم کہ ایں عطیہ و فیض امیرہ ایست — کآوازہ سخاش بہ عالم رسیدہ است
ہر جا کہ نام او برسیدست در جہاں — ہم فیض او رسیدہ وتوام رسیدہ است
آن بانوے خجستہ کہ از فرخ اختری — نامش بہ اوج برشدہ طارم رسیدہ است
آئینہ را اگر شرفِ دست بوس اوست — ایں فیض ہم بہ خامہ وخاتم رسیدہ است
یارب بہ ظل رحمت خویشش نگاہ دار — کز ابر دست او بہ ہمہ نم رسیدہ است

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے اپنی کتاب شبلی کی علمی وادبی خدمات کے آخر میں غیر مطبوعہ کلام شبلی بیاض شبلی سے نقل کیا ہے۔ بیاض شبلی باوجود تلاش بسیار کے دستیاب نہ ہوسکی۔ انہوں نے کتب خانہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ میں اس کے محفوظ ہونے کا ذکر کیا ہے مگر مجھے آج تک اس کی زیارت نہ ہوسکی۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب موصوف کی کتاب کے حوالہ سے شبلی کا غیر مطبوعہ کلام یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

[۶]

گرچہ تاراجِ دل و دیں کردہٗ — عاشقاں را دین و ایمانی ہنوز
تیرِ تو از سینۂ دل خستگاں — بر نمی آید بہ آسانی ہنوز
دین و دل خود آشکارا بردہٗ — ہم چناں از دیدہ پنہانی ہنوز
کشتہ صدرہ دردِ ہجرم، ویں عجب — زندہ ام دردِ گراں جانی ہنوز
نیمۂ از وصفِ تو گم کردہ ام — خوب تر از ماہِ کنعانی ہنوز
شبلیا! چوں زلفِ او، ہم در وصال — جمع گشتی و پریشانی ہنوز

(شبلی کی علمی وادبی خدمات۔ص۳۴۰)

....

[۷]

از جہاں خاطر پریشاں می روم — ہم چو بلبل از گلستاں می روم
در سفر داریم آتش زیرِ پا — ہم چو دودِ شمع پیچاں می روم
دوستاں را ہست شادی و طرب — ما زبختِ خود پریشاں می روم
آتشے داریم در سینہ نہاں — از شرارش سینہ سوزاں می روم
طالعِ واژوں مرا یاری نہ کرد — چوں سکندر زآب حیواں می روم

(شبلی کی علمی وادبی خدمات۔ص۳۴۰)

[۱۳]

متفرق اشعار

(فارسی)

گل غنچہ گشت تا دہنِ او شود نہ شد
بشگفت بازکاں رخِ نیکو شود نہ شد

....

برو سحاب گر آبے زچشمِ خوں بارم
گہر درونِ صدف خوں شود، چوں دانہ انار

....

والہ عارضِ تو دیدہ ورے نیست کہ نیست
بستۂ حلقۂ زلفِ تو سرے نیست کہ نیست

....

ساقیا! باز خیز و ساغر دہ
جامِ مے دردہ ومکرر دہ
فصلِ گل آمد و بہار رسید
مے بدہ کا ینکم خمار رسید

....

چوں سرِ مدحِ دوستانم ہست
بادہ دردہ کہ بادہ جانم ہست

....

اے دل ایں مایہ انتظار کہ بود　　آخر ایں سستی از خمار کہ بود
چشم شوقت بہ رہ گذار کہ بود　　ہوس سرمہ غبار کہ بود
ایں بہ بیں خانہ جلوہ گاہ کہ ہست
پردہ دیدہ فرش راہ کہ ہست

....

خار در دیدہ عدو شکنی　　حاسداں را جگر گداز آئی
ما بہ نادیدہ در رہت باشیم　　کہ تو ناگہ زدر فراز آئی

....

زیں سپس ندوہ وتدریس علوم عرب است

---

[۱۴]

غزلیں

(اردو)

کلیاتِ شبلی اگر چہ سب سے زیادہ جامع اور مفصل ہے، تاہم اس میں علامہ شبلی کی اردو غزلیں شامل نہیں ہیں۔ جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ چونکہ مجموعہ کلام شبلی [سید ظفر الملک علوی] کے علاوہ یہ غزلیں کسی اور مجموعہ میں شامل نہیں اور وہ اب نایاب ہے۔ اس لئے نو دریافت غزلوں کے ساتھ تمام غزلیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔

[۱]

اثر کے پیچھے دلِ حزیں نے نشان چھوڑا نہ ہر کہیں کا
گئے ہیں نالے جو سوئے گردوں تو اشک نے رخ کیا زمیں کا
بھلی تھی تقدیر یا بری تھی، یہ راز کس طرح سے عیاں ہو
بتوں کو سجدے کیے ہیں اتنے کہ مٹ گیا سب لکھا جبیں کا
وہی لڑکپن کی شوخیاں ہیں، وہ اگلی ہی سی شرارتیں ہیں
سیانے ہوں گے تو ہاں بھی ہوگی، ابھی تو سن ہے نہیں نہیں کا
یہ نظم آئیں، یہ طرز بندش، سخنوری ہے، فسوں گری ہے
کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی، مزہ ہے طرز علی حزیں کا

[۲]

تیر قاتل کا یہ احساں رہ گیا — جاے دل سینہ میں پیکاں رہ گیا
کی ذرا دست جنوں نے کوتہی — چاک آکر تا بداماں رہ گیا
دوقدم چل کرترے وحشی کے ساتھ — جادۂ راہ بیاباں رہ گیا
قتل ہو کر بھی سبکدوشی کہاں — تیغ کا گردن پہ احساں رہ گیا
ہم تو پہونچے بزم جاناں تک مگر — شکوۂ بیداد درباں رہ گیا
کیا قیامت ہے کہ کوے یار سے — ہم تو نکلے اور ارماں رہ گیا
دوسروں پر کیا کھلے راز دہن — جب کہ خود صانع سے پنہاں رہ گیا
جذبۂ دل کا ذرا دیکھو اثر — تیر نکلا بھی تو پیکاں رہ گیا
جامۂ ہستی بھی اب تن پر نہیں — دیکھ وحشی تیرا عریاں رہ گیا
ضعف مرنے بھی نہیں دیتا مجھے — میں اجل سے بھی تو پنہاں رہ گیا
اے جنوں تجھ سے سمجھ لوں گا اگر — ایک بھی تار گریباں رہ گیا
حسن چمکا یار کا ، اب آفتاب — اک چراغِ زیر داماں رہ گیا
لوگ پہونچے منزل مقصود تک — میں جرس کی طرح نالاں رہ گیا
بزم میں ہر سادہ رو تیرے حضور — صورت آئینہ حیراں رہ گیا

یاد رکھنا دوستو اس بزم میں
آکے شبلی بھی غزل خواں رہ گیا

[۳]

پوچھتے کیا ہو جو حال شب تنہائی تھا
رخصت صبر تھی یا ترک شکیبائی تھی

شب فرقت میں دل غمزدہ بھی پاس نہ تھا
وہ بھی کیا رات تھی کیا عالم تنہائی تھا

میں تھا یا دیدۂ خوں نابہ فشاں تھی شب ہجر
ان کو واں مشغلۂ انجمن آرائی تھا

پارہائے دل خونیں کی طلب تھی پیہم
شب جو آنکھوں کو مری ذوق خود آرائی تھا

رحم تو ایک طرف پایہ شناسی دیکھو
قیس کو کہتے ہیں مجنوں تھا، صحرائی تھا

آنکھیں قاتل سہی پر زندہ جو کرنا ہوتا
لب میں اے جان تو اعجاز مسیحائی تھا

خون رورو دیے بس دو ہی قدم میں چھالے
یاں وہی حوصلہ بادیہ پیمائی تھا

دشمن جاں تھے ادھر ہجر میں درد و غم و رنج
اور ادھر ایک اکیلا ترا شیدائی تھا

انگلیاں اٹھتی تھیں مژگاں کی اسی رخ پیہم
جس طرف بزم میں وہ کافر ترسائی تھا

کون اس راہ سے گزرا ہے کہ ہر نقش قدم
چشم عاشق کی طرح اس کا تماشائی تھا

خوب وقت آئے نکیرین جزا دے گا خدا
لحد تیرہ میں کیا عالم تنہائی تھا

ہم نے بھی حضرت شبلی کی زیارت کی تھی
یوں تو ظاہر میں مقدس تھا پہ شیدائی تھا

[۴]

تیس دن کے لئے ترک مے و ساقی کر لوں
واعظ سادہ کو روزوں میں تو راضی کر لوں

پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال
ورنہ حاسد تیری خاطر سے میں یہ بھی کر لوں

اے نکیرین قیامت ہی پہ رکھو پرسش
میں ذرا عمر گذشتہ کی تلافی کر لوں

کچھ تو ہو چارۂ غم بات تو یکسو ہو جائے
تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کر لوں

اور پھر کس کو پسند آئے گا ویرانۂ دل
غم سے مانا بھی کہ اس گھر کو میں خالی کر لوں

جورگردوں سے جو مرنے کی بھی فرصت مل جائے
امتحان دم جاں پرور عیسیٰ کرلوں

دل ہی ملتا نہیں سفلوں سے وگر نہ شبلی
خوب گذرے فلک دوں سے جو یاری کر لوں

[۵]

ناتواں عشق نے آخر کیا ایسا ہم کو
غم اٹھانے کا بھی باقی نہیں یارا ہم کو

درد فرقت سے تری ضعف ہے ایسا ہم کو
خواب میں بھی ترے دشوار ہے آنا ہم کو

جوش وحشت میں ہو کیا ہم کو بھلا فکر لباس
بس کفایت ہے جنوں دامنِ صحرا ہم کو

رہبری کی دہن یار کی جانب خط نے
خضر نے چشمۂ حیواں یہ دکھایا ہم کو

دل گرا اس کی زنخداں میں فریب خط سے
چاہ خس پوش تھا اے واے نہ سوجھا ہم کو

واہ کاہیدگی جسم بھی کیا کام آئی
بزم میں تھے پہ رقیبوں نے نہ دیکھا ہم کو

قالب جسم میں جان آگئی گویا شبلی
معجزہ فکر نے اپنی یہ دکھایا ہم کو

[۶]

کچھ اکیلی نہیں میری قسمت — غم کو بھی ساتھ لگا لائی ہے
منتظر دیر سے تھے تم میرے — اب جو تشریف صبا لائی ہے
نکہتِ زلفِ غبار رہ دوست — آخر اس کوچہ سے کیا لائی ہے
موت بھی روٹھ گئی تھی مجھ سے — یہ شب ہجر منا لائی ہے
مجھ کو لے جا کے مری آنکھ وہاں — اک تماشا سا دکھا لائی ہے
آہ کو سوے اثر بھیجا تھا — واں سے کیا جانیے کیا لائی ہے
شبلی زار سے کہہ دے کوئی
مژدۂ وصل صبا لائی ہے

---

[۷]

یار کو رغبت اغیار نہ ہونے پائے — گل تر کو ہوس خار نہ ہونے پائے
اس میں در پردہ سمجھتے ہیں وہ اپنا ہی گلہ — شکوۂ چرخ بھی زنہار نہ ہونے پائے
فتنۂ حشر، جو آنا تو دبے پاؤں ذرا — بخت خفتہ مرا بیدار نہ ہونے پائے
ہائے دل کھول کے کچھ کہہ نہ سکے سوز دروں — آبلے ہم سخن خار نہ ہونے پائے
چپکے وہ آتے ہیں گلگشت کو اے بادصبا — سبزہ بھی باغ میں بیدار نہ ہونے پائے
پھر کہیں جوش میں آجائیں نہ یہ دیدۂ تر — سامنے ابر گہر بار نہ ہونے پائے
باغ کی سیر کو جاتے تو ہو، پر یاد رہے — سبزہ بیگانہ ہے، دوچار نہ ہونے پائے
جمع کر لیجیے غمزوں کو مگر خوبِی بزم — بس وہیں تک ہے کہ بازار نہ ہونے پائے
آپ جاتے تو ہیں اس بزم میں لیکن شبلی
حال دل دیکھیے اظہار نہ ہونے پائے

یہ غزلیں علی گڑھ اورعلی گڑھ جانے سے پہلے کی ہیں اور
مکاتیب شبلی سے لی گئی ہیں۔

خطوط شبلی [مرتبہ: امین زبیری] میں دو اور غزلیں شامل ہیں،
جو آخری دور کی ہیں اور نسبتاً بہتر ہیں۔

[۸]

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہوگی تو کیوں ہوگی
خیال روزۂ وفکرِ وضو ہوگی تو کیوں ہوگی

جو دو دن بھی بسر کر لے گا اس قصر معلیٰ میں
اسے خلد بریں کی آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی

ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے
یہاں فکرِ مے جام وسبو ہوگی تو کیوں ہوگی

جناب نازلی بیگم کو اور نواب صاحب کو
کسی شے کی جو دل میں آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی

کہاں یہ لطف، یہ منظر، یہ سبزہ، یہ بہارستاں
عطیہ! تم کو یاد لکھنؤ ہوگی تو کیوں ہوگی

---

[۹]

یاد صحبت ہائے رنگیں جو جزیرہ میں رہیں
وہ جزیرہ کی زمیں تھی، یا کوئی میخانہ تھا

لطف تھا، ذوق سخن تھا، صحبت احباب تھی
مطرب و رود و سرود و ساغر و پیمانہ تھا

سبزۂ وگل سے بھرا تھا دامن کہسار سب
غیرت خلد بریں ہر گوشۂ ویرانہ تھا

غنچۂ گل کا تبسم تھا، ہر اک دم برق ریز
عندلیبوں کی زباں پر نالۂ مستانہ تھا

نشہ آور تھی نگاہ مست ساقی اس قدر
خود بخود لبریز مے ہر ساغر و پیمانہ تھا

اب نہ وہ صحبت نہ وہ جلسے نہ وہ لطف سخن
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

---

[۱۰]

وہ محجوب وصال آئے کہیں سے
ٹپکتا ہے نگاہ واپسیں سے

عدو افسانہ غم کیا کہے گا!
یہ مضموں کچھ ادا ہوگا ہمیں سے

انہیں افسانہ غم ڈرتے ڈرتے
سنایا کچھ کہیں سے، کچھ کہیں سے

نکل جاتی ہے کیا بچ بچ کے تاثیر
ہمارے نالہ ہائے آتشیں سے

تڑپنے کو ہمارے عرصہ حشر
بھلا کیا ہوگا اتنی سی زمیں سے

(کریسنٹ، لاہور، جنوری ۱۹۷۱ء ص ۰۰)

....

[۱۱]

احباب کو یہ صدا مبارک — یہ مژدۂ جاں فزا مبارک
اس مردمِ چشم مردمی نے — یعنی حافظ حسن علی نے
وہ نامۂ لاجواب لکھا — عالم میں نہیں نظیر جس کا
جو مسئلہ ہے ، وہ مستند ہے — ہر نقطہ سپندِ چشم بد ہے
تصویر یقیں جو ہے تو یہ ہے — شمعِ رہ دیں جو ہے تو یہ ہے
ہر چند کہ نزدِ صاحبِ فن — ہر حرف ہے اک دلیلِ روشن
پر حق میں عدو کے اے دل افروز — ہر سطر ہے، ناوکِ جگر دوز
اس نامۂ نو کا طرز و اسلوب — از بسکہ ہے دل پسند و مرغوب
کچھ ایک عدو نہیں خجل ہے — حاسد بھی حسد سے منفعل ہے
کس طرح سے دیکھ اے معاند! — باطل ہوئی تیری راے فاسد
اب سے بھی اگر بہ جوشِ مستی — ہو تجھ کو خیالِ خود پرستی
میدانِ سخن وسیع تر ہے — دکھلا ، ترے پاس جو ہنر ہے
اوروں سے بھی یاوری طلب کر — کر جمع اساتذہ کو یکسر
کیا یاد کرے عدو ! یہ تو بھی — ہاں کی تھی کسی سے گفتگو بھی
انصار بھی تیرے ، وقتِ پیکار — کھولیں نہ کبھی زبانِ گفتار
اکنوں بہ امید دست گیری — ادعو من حضرۃ القدیری
ان یعصمنی من الدواھی — والامر الیک یا الٰھی

یوں تو کہنے کو اجی سارے جہاں میں زور ہے
بار فرقت جو اٹھائے اس جواں میں زور ہے

(شبلی کی علمی وادبی خدمات۔ ص۴۴۱)

[۱۲]

کھلا عقدہ نہ آغا خاں کی اس شوریٰ طرازی کا
بہت ہم عقل دوڑایا کئے ، ہر چند سر مارا
نظر آیا بالآخر ایک سیاحِ جہاں دیدہ
کہ حل کرد او ز نیرو فراست ایں معمارا
کہا اس نے صلاحِ ترک یورپ پر تعجب کیوں
مگر شاید نمی دانی تو قوم و ملکِ آغا را
یہ ایرانی ہیں، جو ہیں عاشقانِ خانہ برانداز
ہے ان کا قول یہ باوصفِ فقط شاہی دارا
''اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ مارا
بخالِ ہندوش بخشم سمر قند و بخارا را''
(شبلی کی علمی وادبی خدمات۔ص۴۰۵)

---

[۱۵]

متفرق اشعار

(اردو)

یہ اشعار بھی کلیات میں نہیں ہیں:

صریر خامہ شبلی کی آتش افشانی
یہ مان لیجے کہ ہے بھی پر اس میں دم کیا ہے

....

بے خودی وصل کی حظ کب مجھے لینے دیتی
وہ جو آتے ہیں تو میں آپ سے باہر ہوتا

(مکاتیب شبلی ج ۱ص ۱۴۱)

....

ضعف میں بھی یہ مرے تیر فغاں کا زور ہے
روک لے اس کو کہاں یہ آسماں میں زور ہے
نیست تھی اس کی کمر پر تو نے ثابت کر دیا
واہ وا تسنیم کیا تیرے بیاں میں زور ہے

(شبلی نامہ ص ۳۶)

بابِ ہفتم

متفرقات

[۱]

عربی تحریر

سَلامٌ عَلَیکُمْ

هٰذا دیوان الصبابة یصل الیکم واما انی فلا یمکننی حضور لدیکم لانی اشتغلت بامور غیر طائلة وقعدت همتی، وصرفت عنان العنایة الی الدنیا الدنیة وبرئت من تحصیل کمال العلم والادب ذمتی فانی بحمد اللّٰه خلقت وکسب الفضل سیط من دمی، فهو لایفارقنی ان شاء اللّٰه فی حالتی و جودی و عدمی، بل لانی لملازمتی هذه العهدةِ الرذیلة ادوم اتفکر فی حالتی فیزید همی ویزداد ملالتی وبیدکم الانصاف ، ما هذا الا الجور والاعتساف. فصبر جمیل و هو حسبی و نعم الوکیل.   (۱۲ ش نعمانی)

سلام علیکم

یہ دیوان الصبابہ آپ کے پاس جا رہا ہے، میں خود نہ آسکوں گا، اس لئے نہیں کہ میں کسی غیر مفید شغل میں مصروف ہوں اور میری ہمت بیٹھ گئی ہے اور میں نے عنانِ توجہ دنیائے دنی کی طرف موڑ دی ہے اور علم وادب میں حصولِ کمال کی کوششوں سے میں نے اپنی ذمہ داری اٹھالی، میں بحمد اللہ اس طرح بنا ہوں کہ فضل وکمال کے حصول کا جذبہ میرے خون میں ملا ہے، جو انشاء اللہ مجھ سے نہ جیتے نہ مرتے کبھی جدا

ہوگا بلکہ میرے نہ آنے کا سبب یہ ہے کہ میں نے جو یہ معمولی سی ملازمت کر لی ہے اس کے سبب سے میں ہمیشہ اپنی نسبت سونچا کرتا ہوں، اس سے میرا حزن وملال بڑھ جاتا ہے، انصاف آپ کے ہاتھ میں ہے اور میری نسبت اس کے سوا کچھ سمجھنا صریح ظلم ہے، صبر اس حالت میں خوب ہے اور اللہ تعالیٰ مجھے بس ہے اور کیسا کارساز ہے۔

(حیات شبلی۔ص ۱۶۵)

---

[۲]

المعارف

علامہ شبلی علی گڑھ کے زمانہ قیام میں المعارف کے نام سے مسٹر آرنلڈ اور ماسٹر ولایت حسین کے اشتراک سے ایک رسالہ جاری کرنے کا اعلان کیا تھا مگر ابھی ابتدائی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ انہیں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کے حصہ اردو کا ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا چنانچہ وہ رسالہ جاری نہ کر سکے۔ زیرِ نظر تحریر دراصل اسی رسالہ جاری نہ کر سکے۔ زیرِ نظر تحریر دراصل اسی رسالہ کے اجرا اور اس کے مقاصد کے سلسلے میں سر مور گزٹ ناہن میں لکھی تھی جو اتفاق سے پروفیسر اصغر عباس صاحب کے ہاتھ آ گئی تھی اور آثار شبلی میں شامل کی گئی تھی۔

اس رسالے کے جو مقاصد و اغراض ہیں، ان کی زیادہ توضیح کے لئے مناسب ہوگا کہ اس کی تجویز کی ابتدائی تاریخ بیان کی جائے۔ ایک مدت سے اکثر مجھ

کو یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ اسلامی تاریخ میں بہت سے ایسے کارنامے اور چھوٹے چھوٹے دلچسپ واقعات ہیں جن کے لئے کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی جاسکتی۔ان کو قوم اور ملک کے سامنے لایا جائے تو کس پیرائے میں لایا جائے۔مثلاً مسلمانوں کے کتب خانے، رسدگاہیں، سفرنامے، تحقیقات طبی، تمدن و معاشرت اس قسم کے اور بہت سے مضامین ہیں جن کے متعلق تفصیلی معلومات کا سرمایہ موجود نہیں اور جس قدر موجود ہے اس پر الگ الگ کتابیں نہیں لکھی جاسکتیں۔

اس بنا پر خیال ہوا کہ ایک ماہواری رسالے سے یہ کام لیا جائے، چونکہ ملک میں اس قسم کا مذاق اتنا عام نہ تھا کہ صرف اس محدود عنوان پر کوئی ماہوار رسالہ اشاعت پا سکتا، اس لئے یہ تجویز عمل میں نہ آسکی۔مصر و روم کے سفر میں اس ارادے کو تحریک ہوئی کہ ان ممالک میں جہاں قدیم اسلامی تاریخ کے ذخیرے ڈھونڈھتا رہا، یہ بھی دیکھتا تھا کہ مسلمانوں کی موجودہ تعلیم و تربیت کا کیا نقشہ ہے۔ بہت سی باتیں خود تحقیق کیں اور اکثر اخبارات اور علمی رسالے دیکھے، جن سے یہ امید ہوئی کہ معلومات کا یہ سلسلہ آئندہ بھی قائم رہ سکتا ہے۔یعنی ان ملکوں میں جو تربیت اور طرز تعلیم ہے اور جو کچھ اس میں اصلاحیں اور ترقیاں ہوتی رہتی ہیں، وہ وقتاً فوقتاً ان اخبارات و رسالوں کے ذریعہ سے معلوم ہوسکتی ہیں۔اس طرح اگر مسلمانوں کی قدیم تاریخ کے ساتھ جدید تاریخ کو بھی شامل کرلیا جائے تو مضمون وسیع ہو جائے گا اور اس کی بنا پر ایک مستقل رسالہ کا جاری کرنا بے جا نہ ہوگا۔

ان باتوں پر مرا ارادہ راسخ نہ ہوا تھا لیکن خوش قسمتی سے بعض غیر مترقب اسباب پیدا ہو گئے، جن کے بعد مجھ کو کسی حالت منتظرہ کا انتظار نہ رہا۔مسٹر آرنلڈ جو ہمارے کالج میں فلاسفی کے پروفیسر ہیں، انگریزی کے سوا یورپ کی کئی زبانیں جانتے ہیں اور چونکہ ایک مدت سے دعوت اسلام پر وہ ایک بہت بڑی کتاب لکھ رہے

ہیں، اس لئے ان زبانوں میں جس قدر تصانیف، اسلام اور تاریخ اسلام کے متعلق ہیں، ان کا بہت بڑا حصہ ان کی نگاہ سے گزر چکا ہے۔ صاحب موصوف سے جب میں نے اپنے خیالی رسالے کا تذکرہ کیا تو انہوں نے نہایت آمادگی سے اس کی اعانت کا وعدہ کیا اور اجازت دی کہ ان کا نام رسالہ کے ایڈیٹروں میں شامل کیا جائے۔ ان کے ساتھ ہمارے کالج کے سکنڈ ماسٹر میر ولایت حسین صاحب نے بھی ایڈیٹری قبول کی اور اس طرح مجھ کو اس کام میں دونوں بازو مل گئے اور رسالے کو دوسر پرست ہاتھ آ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل یورپ نے اور علوم وفنون کے ساتھ علم تاریخ کو اس بلند رتبہ پر پہونچا دیا ہے کہ کوئی قوم گو اپنی ہی تاریخ لکھنی چاہے یورپ کی تصنیفات سے بے نیاز نہیں ہوسکتی۔

جس قسم کے مضامین اس رسالے میں وقتاً فوقتاً شائع ہوں گے ان کی تفصیل اس طرح ہے:

[۱] مسلمانوں کی علمی اور عملی ترقیاں۔

[۲] اسلامی تاریخانہ مسائل کی تحقیقات اور یورپ کے مصنفین نے جہاں ان کے متعلق غلطی کی ہے ان کی اصلاح۔

[۳] مشہور مصنفین اسلام کی سوانح عمریاں۔

[۴] عربی فارسی اور اردو زبان کی انشاپردازی اور علم اللسان کی تحقیقات۔

[۵] مصر وروم و ہندوستان کی موجودہ تعلیم وتربیت وتصانیف۔

[۶] یورپ اور مصر و بیروت کے میگزینوں میں جو آرٹکل کسی حیثیت سے اسلام کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں ان کے ترجمے۔

کسی حال میں اس رسالے کو پالیٹکس اور مذہبی بحثوں سے سروکار نہ ہوگا۔
یہ رسالہ ۳۲ صفحوں میں ہوگا اور خط خوبصورت اور ۲۶x۲۰ کے آٹھویں حصے پر بہت

صاف چھپوایا جائے گا۔ قیمت سالانہ مع محصول ڈاک دو روپیہ آٹھ آنہ ہے۔ چھپائی وغیرہ کے اخراجات ادا کرنے کے بعد جو توفیر ہوگی وہ اسی رسالے کی وسعت اور ترقی دینے یعنی ان میگزینوں اور کتابوں کے بہم پہونچانے میں صرف ہوگی جو رسالے کی زیادہ ترقی کا سبب ہوں۔ قیمت چونکہ پیشگی لی جائے گی اس لئے قیمت کے وصول کا آسان طریقہ ہے کہ جن لوگوں کے نام پر چہ روانہ کیا جائے تین یا چھ مہینے کی قیمت کا حساب لگا کر ویلو پے ابل روانہ کیا جائے اور جب یہ مدت ختم ہو چکے تو پھر اخیر پرچہ اسی طرح ویلو پے ابل بھیجا جائے۔

رسالہ کا پہلا پرچہ پہلی مارچ کو شائع ہوگا جو صاحب خریداری کی درخواستیں بھیجیں زر نقد ہرگز نہ بھیجیں بلکہ اس میں ویلو پے ابل بھیجنے کی اجازت ہو۔

المشتہر شبلی نعمانی

پروفیسر مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ (ممالک مغربی وشمالی)

(سرمور گزٹ، ناہن، مورخہ ۳/فروری ۱۸۹۳ء صفحہ ۷، ۸)

---

[۳]

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ضمیمہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کو علمی آب و تاب دینے کے لئے ۱۸۹۴ء میں علامہ شبلی کو اس کے اردو حصہ کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ علامہ شبلی نے اس پر ایک صفحہ کا نوٹ لکھا

اور جو عرصہ تک میگزین کے دوسرے ٹائٹل صفحہ پر شائع ہوتا رہا۔ علامہ شبلی کی یہ تحریر اب تک کہیں شائع نہیں ہوئی ہے۔

قریباً چار برس ہوئے کہ اس نام کا ایک رسالہ انگریزی اور اردو ملا ہوا علی گڑھ کالج سے نکلنا شروع ہوا۔ اول اول وہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا ضمیمہ بن کر نکلتا رہا لیکن ۱۸۹۴ء میں اس نے ایک مستقل رسالہ کی صورت اختیار کی۔ اس کے مضامین زیادہ تر کالج کی خبروں اور اس کے متعلقات پر محدود ہوتے تھے اور اس وجہ سے عام پبلک کو اس کے ساتھ چنداں دلچسپی نہ تھی۔

اس خیال سے اس کے منتظموں نے اس کو زیادہ وسعت دینی چاہی تاکہ وہ بالکل ایک علمی میگزین بن جائے، جس میں کالج کی خبروں کے علاوہ مسلمانوں کے علوم وفنون تاریخ لٹریچر کے متعلق مفید اور پر زور مضامین لکھے جائیں۔ اس صیغہ کا اہتمام خاص میری سپردگی میں دیا گیا۔ میں اس رسالہ کے ترقی دینے میں حتی الامکان کوشش کروں گا۔

ملک کے مشہور اہل قلم یعنی مولانا حالی، نواب محسن الملک، مولوی نذیر احمد اور منشی ذکاءاللہ وغیرہ بزرگوں نے اس میں مضامین لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ اور اہل قلم بھی اگر اس کی قلمی اعانت فرمائیں گے تو ہم نہایت فخر کے ساتھ قبول کریں گے۔

ہم کو امید ہے کہ ہندوستان کی اسلامی جماعت خریداری سے اس کی اشاعت میں مدد دیگی۔ میگزین کے کل صفحات ۴۰؟ رہیں اور قیمت مع محصول ڈاک (للے عہ)

---

[۴]

ندوۃ العلما کا تیسرا سالانہ جلسہ

تحریک ندوۃ العلماء کے تیسرے جلسے میں علامہ شبلی نے شرکت کی تھی، اس زمانہ میں وہ محمڈن اینگلواورینٹل کالج میگزین علی گڑھ کے ایڈیٹر تھے چنانچہ اس اجلاس کی روداد قلم بند کی۔ یہ روداد اب تک کسی مجموعہ مقالات میں شامل نہیں ہے۔ غالبًا سید صاحب کی بھی نظر سے نہیں گذری تھی۔

ندوۃ العلما کا یہ تیسرا سالانہ جلسہ تھا جو نہایت شوکت وشان، اور جاہ وجلال کے ساتھ بریلی میں انجام پایا۔ اول اس کی مہمانی کی صدا کلکتہ سے بلند ہوئی، پھر امرت سر نے اپنی تمنا کا اظہار کیا، لیکن بنگال اور پنجاب دونوں کا جذب محبت چنداں قوی نہ تھا اور اس وجہ سے وہ اس مہمانِ عزیز کے شرفِ قدوم سے محروم رہ گئے۔

اس سال ندوہ کی کامیابی کی پہلی مبارک فال یہ تھی کہ جلسہ سے کچھ پہلے اس کی مخالفت کا چرچا شروع ہوا اور دو مولوی صاحبوں نے یہ کہہ کر یہ جلسہ لا مذہبوں، وہابیوں، نیچریوں کا جلسہ ہے۔ پبلک میں سخت ہل چل ڈالنی چاہی، اول انہوں نے خود ندوہ کو مخاطب کیا، لیکن جب ندوہ نے ان کی طرف کچھ توجہ نہ کی تو انہوں نے نہایت سرگرمی سے مخالفت پر کمر باندھی۔ تہمت آمیز رسالے لکھے، اشتہارات دئے، جابجا لوگوں کے بہکانے کے لئے نقیب دوڑائے، بدمعاشوں کو فساد پر آمادہ کیا، غرض تدبیر کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ لیکن ندوہ کے کارپردازوں کا یہ حال تھا کہ

چیں بر جبیں ز جنبش ہر خس نہ می زنند
دریا دلاں چو آبِ گہر آرمیدہ اند

بہر حال جلسہ ہوا اور اس شان وشوکت سے ہوا کہ مخالف بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ ہندوستان کے ہر گوشہ سے لوگ آئے اور حاضرین کی تعداد کسی جلسہ میں تین چار ہزار سے کم نہیں ہوئی۔

صدر انجمنی کے لئے جناب مولوی لطف اللہ صاحب مفتی عدالت العالیہ حیدرآباد دکن کی خدمت میں درخواست بھیجی گئی تھی اور چونکہ اتفاق سے ان دنوں عدالت کے اور جج باہر چلے گئے تھے، وزارت کے اعلی عہدہ داروں نے اجازت دینے سے انکار کیا لیکن جب خود وزارت پناہ نواب مدارالمہام بہادر تک یہ قصہ پہنچا تو انہوں نے انکار پر ناخوشی ظاہر کی اور مولوی صاحب موصوف کو پانچ سو روپے زادراہ عنایت کئے کہ جلسہ کی شرکت کے لئے تشریف لے جائیں، لطف یہ کہ مخالفوں نے تحریر کے ذریعہ سے ہر جگہ یہ مشہور کیا تھا کہ مولوی لطف اللہ صاحب ندوہ کے سخت مخالف ہیں، چنانچہ ان کی طرف سے اس مضمون کا ایک فتویٰ بھی شائع کر دیا تھا۔

۱۱/اپریل کو پہلا اجلاس منعقد ہوا، سکریٹری کی طرف سے ان کے نائب نے سال گذشتہ کی رپورٹ پڑھی، رپورٹ اگرچہ بہت قابلیت سے نہیں لکھی گئی تھی لیکن ہر قسم کے ضروری واقعات کی پوری تفصیل تھی، رپورٹ میں ظاہر کیا گیا تھا کہ ندوہ کے دو مقصد ہیں: (۱) اصلاح طریقہ تعلیم (۲) رفع نزاع علما۔ ان دونوں مقصدوں کے متعلق سال حال میں پوری کوشش کی گئی۔ اصلاح نصاب کے لئے ایک خاص جلسہ کان پور میں منعقد ہوا جس میں دور دور سے علما شریک ہوئے۔ رفع نزاع کے متعلق مولوی ابرہیم صاحب اور مولوی امانت اللہ صاحب کی کارروائی کا حوالہ دیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ندوہ میں غالب حصہ ان علما کا ہے جو ابھی تک ندوہ کے

مقاصد سے آشنا تک نہیں ہیں، جن بزرگوں نے ندوہ کو قائم کیا ہے اور جو درحقیقت اس کل کے اصلی پرزے ہیں، ان کی تعداد بہت کم ہے اس وجہ سے اصلاح نصاب یا رفع نزاع، کوئی کارروائی اچھی طرح عمل میں نہیں آسکتی۔

ندوہ کے کارکنوں نے اس نکتہ کو بخوبی سمجھ لیا ہے اور اس وجہ سے انہوں نے اس اصلی تدبیر کو اختیار کرنا چاہا ہے جو ہر قسم کی اصلاحوں کی بنیاد ہے۔ چنانچہ ہم اس کا ذکر دوسرے دن کی کارروائی کے بیان میں کریں گے۔

رپورٹ پڑھی جانے کے بعد پروگرام کے موافق چند علما نے ندوہ کے مقاصد پر گفتگو کی۔ اگر چہ یہ نہایت اہم امر تھا کیونکہ تین برس گذر جانے پر بھی اب تک بہت سے لوگوں نے ندوہ کے مقاصد نہیں سمجھے اور اسی غلط فہمی کا اثر تھا کہ بعض مولویوں کی اس سال علانیہ مخالفت کی، لیکن افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ علما بجائے اس کے کہ ندوہ کے مقاصد کی تشریح کرتے وعظ کہنا شروع کر دیتے تھے اور چونکہ عوام کی طرف سے تاثر اور حسن قبول کا اظہار ہوتا تھا وعظ کے لئے برابر بڑھتے جاتے تھے، یہاں تک کہ بعضوں نے اپنی تمام تقریر میں ندوہ کا نام تک نہیں لیا، حقیقت میں اس بات کا نہایت افسوس ہے کہ آج کل علما میں جو کچھ حسن تقریر اور سحر بیانی پائی جاتی ہے، وہ ایک خاص دائرہ تک محدود ہے۔ اس سے نکل کر وہ بالکل بے سرے ہو جاتے ہیں اور کسی طرح تقریر پر ان کو قابو نہیں رہتا۔

دوسرے دن دارالعلوم کا مسودہ پیش ہوا اور یہی وہ تدبیر ہے جس کا ابھی ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ دارالعلوم کا یہ مسودہ کئی مہینے پہلے شائع کر دیا گیا تھا لیکن باضابطہ طور پر پیش نہیں ہوا تھا، دارالعلوم کی تجویز کا حاصل یہ ہے کہ ایک بہت بڑا عربی کا مدرسہ قائم کیا جائے، جس کے اصول یہ ہوں:

طالب علموں کو ایک خاص قسم کی تربیت کے ساتھ تعلیم دی جائے۔ چنانچہ

اس غرض کے لئے تجویز کیا گیا ہے کہ ایک نہایت وسیع بورڈ نگ ہوس بنایا جائے۔ ہر ہر طالب العلم کے لئے الگ الگ کمرہ ہو۔تمام طالب العلم ایک ساتھ کھانا کھائیں۔ ایک سا لباس پہنیں ۔ایک ساتھ تفریح اور سیر میں مشغول ہوں۔کوئی طالب العلم جا گیراور خیرات کے طور پر کسی کے ہاں کھانا نہ کھائے۔

ہر ہر علم اور فن کی تعلیم کے لئے الگ الگ مدرس ہوں اور ہر فن کا وہی شخص مدرس ہو جو تمام ہندوستان میں اس فن کے لحاظ سے مسلم الثبوت استاد ہو۔

مدرسہ کے احاطہ میں ایک بہت بڑا کتب خانہ ہو اور چند طلبا فراغ تحصیل کے بعد ایک مدت معین تک اس کتب خانہ کے ذریعہ سے کسی خاص فن میں کمال پیدا کریں اور اس غرض کے لئے اس مدت تک ان کا معقول روزینہ مقرر کیا جائے۔

ادب اور بلاغت کے مدرسین شام و مصر و عرب سے بلوا کر مقرر کئے جائیں۔

مدرسہ کے احاطہ میں ایک مکان ہو جس میں تمام عربی اور فارسی زبان کے اخبارات منگوا کر رکھے جائیں اور طالب العلموں کو تاکید کی جائے کہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔

طالب العلموں کو اسپیکری اور مقرری کی تعلیم دی جائے تاکہ ہر قسم کے مضامین پر لکچر دے سکیں۔

اس قسم کی اور بہت سی باتیں اس مسودہ میں مذکور ہیں اور ان کی تکمیل کے لئے ۱۰؍لاکھ کے سرمایہ کی ضرورت بیان کی گئی ہے۔جلسۂ عام میں پیش ہونے کے قبل یہ مسودہ علما کے ایک خاص اجلاس میں پیش کیا گیا تھا،اس وقت بعضوں نے اس بنا پر مخالفت کی کہ اس سے مدارس موجودہ کو ضرر پہنچے گا۔بعضوں نے کہا کہ ۱۰؍لاکھ سرمایہ کا جمع ہونا ایک ناممکن امر ہے۔لیکن ان تمام شبہات کا جواب دیا گیا،اور بجز دو

تین شخصوں کے جن میں ایک مولوی ابراہیم صاحب بھی تھے، سب نے اتفاق کیا۔ جلسۂ عام میں جب یہ مسودہ پیش ہوا تو سب نے موافقت کی اور بہ اتفاق عام یہ تجویز منظور ہوئی۔

تیسرے اجلاس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ اشاعتِ اسلام کے لئے تنخواہ دار واعظ مقرر کئے جائیں، چونکہ یہ ایک خوش آئند تجویز تھی اس لئے بڑے جوش کے ساتھ منظور کی گئی۔

ان اصلی کارروائیوں کے سوا شعرا نے قومی نظمیں پڑھیں، جن میں سے مولوی فضل رب صاحب عرشی شاعرِ دربار حضور نظام دکن کا ترکیب بند بہت مقبول ہوا۔ مولوی سلیمان صاحب کی واعظانہ تقریر نے لوگوں پر جادو کا سا اثر کیا۔ اس کے بعد مختلف شہروں سے ندوہ کے متعلق جو سپاس نامے آئے تھے وہ پیش ہوئے۔ ان میں بڑے جوش کے ساتھ ندوہ کے مقاصد کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا۔ سب سے اخیر میں نذرانے پیش ہوئے اور اگرچہ باعلان کہہ دیا گیا تھا کہ ندوہ میں اجلاس میں کسی قسم کا چندہ کھولنا مقصود نہیں تاہم لوگ نہایت الحاح کے ساتھ نذر کے قبول کرنے پر اصرار کرتے تھے، چنانچہ عین جلسہ میں پانچ، سات سو کی رقم جمع ہوگئی۔ بعض ریاستوں کی طرف سے بھی نذرانے آئے تھے، چنانچہ ریاست جوناگڑھ نے خاص ایک وکیل کی معرفت اپنا نذرانہ بھیجا تھا۔

ندوہ کے اس اجلاس سے یہ رائے قطعی طور پر قائم کی جاسکتی ہے کہ ندوہ درحقیقت ایک مضبوط انسٹی ٹیوشن کے درجہ تک پہنچ گیا ہے۔ البتہ اس کے قائم رکھنے اور اس کو مفید طریقہ پر استعمال کرنے کے لئے تھوڑی سی اور زیادہ لیاقت درکار ہے۔ لیکن علما کے خیالات میں روز بروز جو وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے، اس سے بہرحال توقع ہے کہ ندوہ کی رفتارِ ترقی برابر تیز ہوتی جائے گی۔ یہ بات علانیہ محسوس ہوتی تھی

کہ ندوہ کے پہلے اجلاس میں علما کی جو حالت تھی اس میں بہت بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ تعصب کے بجائے فیاض طبعی پیدا ہو گئی ہے۔ تنگ ظرفی، فراخ حوصلگی سے بدل گئی ہے اور جن اختلافات کی بنا پر تکفیر اور تفسیق کے فتوے دئے جاتے تھے، اب معمولی اختلاف رائے کی حد تک آ گئے ہیں۔ یہاں تک تو ہو چکا ہے، آئندہ بہت کچھ امیدیں ہیں خدا ان کو بر لائے۔

بجز امید کہ ایمانِ عشق کیشان است
کسے نداد تسلی دلِ زلیخارا

(محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین، مئی ۱۸۹۶ء۔ جلد ۳، نمبر ۵۔ ص ۲۰۱-۲۰۶)

---

[۵]

تراجم کتب

۱۹۰۳ء میں علامہ شبلی جب انجمن ترقی اردو کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے تو وہ سب سے پہلے مختلف موضوعات کی اہم کتابوں کے تراجم کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک منصوبہ کے تحت انہوں نے ترجمے کے کام کا آغاز کیا۔ اس کی تفصیلات بھی وہ اخبارات میں پیش کرتے رہے۔ اس سلسلے میں وکیل امرت سر میں ۲/اکتوبر ۱۹۰۳ء کو درج ذیل اطلاع شائع ہوئی ہے۔

''حسب ذیل کتابیں ترجمہ کے لئے منتخب ہوئی ہیں جو صاحب ان میں

سے کسی کتاب کا ترجمہ فرمانا چاہیں وہ اس کتاب کے پہلے دس صفحوں کا ترجمہ کر کے ۱۵ر نومبر ۱۹۰۳ء تک ان کے پاس بھجوا دیں۔ کمیٹی انتظامی جن صاحب کا ترجمہ بہتر خیال کرے گی، ان سے ساری کتاب کا ترجمہ کرائے گی۔ مترجمین کو معقول صلہ دیا جائے گا جس کا تصفیہ سکریٹری صاحب سے کرنا چاہئے۔

عربی

۱۔اخبا الطّوال۔ابوحنیفہ دینوری

۲۔معارف ابن قتیبہ

انگریزی

۱۔Hero worship by Carlyle یعنی ناموران عالم کی سوانح عمری

۲۔Hebbert leelures by Max Muller یعنی مذہب کی تحقیقات سے متعلق پروفیسر میکس مولر کی کتاب

۳۔Industrial Education by Sir Philip Magnus یعنی تعلیم صنعت وحرفت سر فلپ میگ نس

۴۔Preplans of future یعنی مسائل آئندہ

عربی کی کتابیں مرزا محمد شیرازی مالک الکتاب محلّہ عمر کھاڑی نمبر ۱۲۹ر بمبئی اور انگریزی کی کتابیں تھیکر کی دکان سے مل سکتی ہیں۔''

(بحوالہ صحیفہ لاہور اکتوبر ۱۹۷۰ء۔ص ۷۵-۷۶)

[۶]

چندہ برائے انجمن ترقی اردو

وکیل امرت سر ۸؍فروری ۱۹۰۴ء کی اشاعت میں یہ رپورٹ شائع ہوئی ہے۔

''ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ مقام بمبئی (صیغہ شعبہ علمیہ) میں کثرت آراء سے یہ فیصلہ ہوا کہ انجمن اردو کے کاموں کو اس قدر وسعت ہوگئی ہے کہ اب اس کے لئے جداگانہ ایک سرمایہ جمع کرنے کی ضرورت ہے اس لئے عام چندہ کھولا جائے اور جو چندہ آتا جائے اخباروں کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً مشتہر کیا جائے، اس بنا پر عام چندہ کھول دیا گیا ہے۔

سب سے پہلے جو رقم موصول ہوئی ہے وہ مولوی نظام الدین صاحب بی. ایل ڈپٹی کمشنر برار کی عطیہ ہے، چنانچہ یہ رقم مع ان چندوں کے جو علم دوست حضرات نے خود عطا کئے تھے حسب ذیل ہے:

۱۔ جناب مولوی نظام الدین حسن صاحب

۲۔ جناب شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب ال.ال.ڈی

۳۔ جناب نواب مزمل اللہ خاں صاحب

۴۔ جناب خان بہادر منشی الٰہی بخش صاحب رئیس دہلی

۵۔ جناب مولوی عزیز مرزا صاحب بی اے کمشنر بیڑ

واضح ہو کہ جو صاحب سو یا سو سے زیادہ چندہ عطا فرمائیں گے وہ انجمن کے

ممبر اعزازی تصور ہوں گے۔''

(بحوالہ صحیفہ لاہور اکتوبر ۱۹۷۰ء۔ص ۷۶-۷۷)

---

[۷]

انجمن کی ایک رپورٹ

پروفیسر آرنلڈ جو انجمن ترقی اردو کے صدر تھے اپنے وطن جانے لگے تو نئے صدر اور بعض دوسرے مسائل سے متعلق انجمن کی ایک میٹنگ ہوئی اس کی رپورٹ وکیل امرت سر ۴/مارچ ۱۹۰۴ء میں علامہ شبلی کے قلم سے شائع ہوئی۔

''۱۴/فروری کو انجمن کا ایک غیر معمولی اجلاس ہوا۔ سکریٹری نے بیان کیا کہ چوں کہ مسٹر آرنلڈ صاحب بوجہ ترک تعلق ہندوستان انجمن ہٰذا کی پریسیڈنٹی سے علاحدہ ہونے والے ہیں اس لئے انجمن ہذا کی طرف سے ان کی اس توجہ اور سرگرمی کے شکریہ میں جو انہوں نے انجمن کی ترقی کے متعلق برابر مبذول رکھی، کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔

بہ اتفاق یہ طے ہوا کہ جناب ممدوح کی خدمت میں ایک ایڈریس انجمن کی طرف سے پیش کیا جائے جس کو سکریٹری اور بعض ممبر بمبئی میں جناب ممدوح کی خدمت میں پیش کریں۔

اس کے بعد جدید پریسیڈنٹ کے انتخاب کے متعلق بحث ہوئی اور قرار پایا

کہ باہر کے ارکان سے رائے طلب کی جائے۔

شبلی نعمانی

حیدر آباد۔۱۴؍فروری ۱۹۰۴ء‘‘

(بحوالہ صحیفہ لاہور اکتوبر ۱۹۷۰ء۔ص ۷۷-۷۸)

---

[۸]

انجمن کے دستور العمل میں ترمیم

انجمن ترقی اردو کے دستور العمل میں ترمیم کی گئی تو اس کی اطلاع بھی وکیل امرت سر ۱۳؍نومبر ۱۹۰۴ء میں کے ذریعہ کی گئی۔

’’دستور العمل انجمن ترقی اردو میں کثرت آراء سے اس قدر ترمیم ہوئی ہے کہ جو حضرات انجمن کی مصدقہ کتابیں ایک سال میں ۵؍روپئے قیمت تک کی خریدنا منظور فرمائیں گے وہ ارکان اعانت میں شمار کئے جائیں گے۔ اس اطلاع عام کے واسطے یہ تحریر شائع کی جاتی ہے۔

شبلی نعمانی

سکریٹری انجمن ترقی اردو

مقام حیدر آباد

(بحوالہ صحیفہ لاہور اکتوبر۔۱۹۷۰ء۔ص ۷۸)

---

[۹]

سودیشی تحریک

مدیر ماہنامہ زمانہ کان پور نے ایک سوال نامہ کے ذریعہ ادباء و شعراء سے چند سوالات دریافت کئے تھے۔ علامہ شبلی نے بھی اس کا جواب لکھا تھا جو زمانہ کان پور جنوری ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا ہے اور جو مکاتیب شبلی میں بھی شامل ہے، اس کے علاوہ مدیر زمانہ نے ایک اور سوال نامہ تیار کیا تھا جس میں مسلمان زعما سے سودیشی تحریک کے بارے میں درج ذیل سوالات پوچھے تھے:

۱۔ سودیشی تحریک بذات خود ملک کے لئے کہاں تک مفید ہے اور اس تحریک کے نشیب و فراز، نفع و نقصان اور عمل درآمد کے متعلق آپ کی مفصل رائے کیا ہے؟

۲۔ اس تحریک میں ہندوستان کے اتفاق کی کہاں تک ضرورت ہے، خاص مسلمانوں کے لئے اس سے کوئی نفع یا نقصان پہنچنے کی کہاں تک امید ہے؟

۳۔ اس تحریک کی کامیابی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے اور اس کی کامیابی ہندوستانی مسلمانوں پر جداگانہ اور ملک پر بہ حیثیت مجموعی کیا اثر ہوگا۔

علامہ شبلی نے اس کے جواب میں لکھا کہ:

سودیشی تحریک اگر گورنمنٹ کے دھمکانے کے لئے ہے تو بہت بری چیز ہے ورنہ اس سے بہتر کیا چیز ہوسکتی ہے۔

البتہ کامیابی میں کسی قدر شبہہ ہے۔ ہندوستانیوں کا جوش عموماً ہانڈی کا ابال ہوتا ہے۔ خود کلکتہ میں وہ زور نہ رہا۔ ایک دکان پر میں نے خود ایک بنگالی کو دیکھا کہ وہ یہ کہہ کر اسباب مانگتا تھا کہ مجھ کو دیسی اور ولایتی تفریق سے کوئی غرض نہیں۔

سفر کو روانہ ہوتا ہوں ورنہ مفصل لکھتا۔ شبلی

(ماہنامہ زمانہ کان پور۔ اپریل ۱۹۰۶ء)

---

[۱۰]

اولڈ بوائے

بنارس سے اولڈ بوائے کے نام سے ستمبر ۱۹۱۰ء میں ایک رسالہ جاری ہوا تھا اس کے ایڈیٹر نے علامہ شبلی کو خط لکھ کر اولڈ بوائے کا الندوہ سے تبادلہ کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی علامہ شبلی نے اس کے جواب میں جو خط لکھا تھا اسے ایڈیٹر نے اولڈ بوائے دسمبر ۱۹۱۰ء میں شائع کیا ہے۔

اولڈ بوائے کا جب پہلا پرچہ وصول ہوا اس وقت میں نے سب ایڈیٹر سے کہہ دیا تھا کہ الندوہ تبادلہ میں جاری کر دیں۔ البتہ جورہ گیا تھا وہ اب کے ہوگا۔ کاش ''اولڈ بوائے'' خالی اولڈ ہوتا کہ ہم جیسے پیر فرتوت بھی شامل ہوسکتے۔ کیا پرانے اساتذہ اس دائرہ میں نہیں آسکتے، یا سینگ کٹائے بغیر کام نہ چلے گا۔

ہر چند کہ پیر خستہ دل و ناتواں شدم
ہر گاہ کہ یاد مدرسہ کردم جوان شدم
(بحوالہ صحیفہ لاہور، اکتوبر ۱۹۷۰ء۔ص ۸۱)

---

[۱۱]

عمادالملک کا کتب خانہ

علامہ شبلی نے اپنی تمام کتابیں کتب خانہ ندوہ کو دے کر اسے باقاعدہ کتب خانہ بنانے کا آغاز کیا پھر ان کے دوست نواب علی حسن خاں نے اپنا کتب خانہ وقف کیا۔ اس کے بعد ان کی تحریک پر نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے اپنا کتب خانہ ندوہ کو مرحمت فرمایا، علامہ شبلی نے ایک خط کے ذریعہ اس کی اطلاع مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار کو دی، چنانچہ انہوں نے ۲۰/ مارچ ۱۹۱۱ء کے شذرات میں علامہ شبلی کے خط کا اقتباس درج کیا۔

''میں نہایت مسرت سے اطلاع دیتا ہوں کہ نواب صاحب (عمادالملک سید حسین بلگرامی) موصوف نے اپنا نادر کتب خانہ جو تین ہزار سے زیادہ کتابوں پر مشتمل ہے دارالعلوم ندوہ کو عنایت فرمایا ہے۔ یہ ندوہ کی ایک بڑی کامیابی ہے۔''

(بحوالہ صحیفہ لاہور، اکتوبر ۱۹۷۰ء۔ص ۸۲)

---

[۱۲]

وقف اولاد

علامہ شبلی نے وقف علی الاولاد کی جو تحریک چلائی تھی اس پر انہوں نے متعدد تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔ اخبار پیسہ لاہور کے ایڈیٹر مولوی محبوب عالم کو انہوں نے ایک خط کے ذریعہ کامیابی کے قریب پہونچنے کی اطلاع دی تھی۔ انہوں نے اس خط کا ایک اقتباس اخبار پیسہ ۲۹/مارچ ۱۹۱۱ء کے شذرات میں شائع کیا ہے۔

''خدا کا شکر ہے وقف اولاد کے متعلق ندوۃ العلماء کی طرف سے جو کوشش ایک مدت سے جاری تھی، وہ کامیابی کے سرحد کے قریب آ گئی ہے۔ چنانچہ کونسل میں وقف کا مسودہ پیش ہو گیا اور تمام غیر سرکاری ممبروں نے جن میں ہندو ممبر بھی شامل تھے، اس کی پرزور تائید کی۔ اب اخیر کارروائی انجام دینے کے لئے ۴/اپریل ۱۹۱۱ء کو ایک عام جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوگا۔''

(صحیفہ لاہور اکتوبر ۱۹۷۰ء۔ ص ۸۲)

[۱۳]

انجمن اسلام جنجیرہ

نواب جنجیرہ نے علامہ شبلی کو انجمن اسلام جنجیرہ میں لکچر کے لئے مدعو کیا، چنانچہ وہ ۱۲را کتوبر ۱۹۰۹ء کو جنجیرہ گئے اور ۱۳را کتوبر ۱۹۰۹ء کو لکچر دیا۔ یہ لکچر کس موضوع پر تھا اس کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔ ۱۴را کتوبر ۱۹۰۹ء کو انہوں نے انجمن اسلام جنجیرہ کا معائنہ کیا اور کتاب الرائے میں اپنے تاثرات قلم بند کئے۔ آثار شبلی کی تصنیف کے زمانہ میں وہ تاثرات راقم کو ملے تو اسے اولاً آثار شبلی میں شامل کیا گیا، اہمیت کے پیش نظر یہاں بھی درج کیا جاتا ہے۔

''مجھ کو یہ معلوم کر کے نہایت خوشی ہوئی کہ ایسے چھوٹے سے دور افتادہ مقام میں جیسا کہ یہ جزیرہ ہے، ایک انجمن قائم ہے۔ جس نے اپنا مقصد مسلمان بچوں کا تعلیم دلوانا قرار دیا ہے اور اس غرض سے اس نے ایک بورڈ نگ ہوس [ہاؤس] کھولا ہے، جس میں تقریباً ۲۳ر بچے مقیم ہوکر اسکول میں تعلیم پاتے ہیں۔ مسلمانوں میں اشاعت تعلیم کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں کہ ہر جگہ اسلامی بورڈ نگ کھولے جائیں اور سرکاری مدارس میں تعلیم دلائی جائے۔

انجمن نے اس مقصد کے لئے دو برس کی قلیل مدت میں آٹھ ہزار روپئے جمع کئے، جو ایک صریح اور بین کامیابی ہے۔ ۱۳را کتوبر ۱۹۰۹ء کو میں نے بورڈ نگ ہوس [ہاؤس] اور طلبہ کو دیکھا۔ چونکہ انجمن نے مجھ سے لکچر دینے کی خواہش کی تھی اور وقت

کم تھا اس لئے میں طلبہ کی طریق ماند و بود کو نہ دیکھ سکا۔ وہ صاف ستھرے نظر آتے تھے اوران کی صورتوں سے زندہ دلی اور ہوشیاری محسوس ہوتی تھی۔

ایک ایسا بورڈنگ جس کے کارکن ایسے مستعد ہوں، اور جس کو ہز ہائنس جیسا روشن خیال والئ ملک اور ہر ہائنس جیسی تعلیم یافتہ رئیسہ ہات آئے، ہر قسم کی ترقی کی صحیح امید کرسکتا ہے۔

خاکسار۔شبلی نعمانی

۱۴/اکتوبر۱۹۰۹ء''

---

[۱۴]

رپورٹ ترجمۂ قرآن مجید بہ زبانِ انگریزی'

علامہ شبلی نے انگریزی ترجمہ قرآن کے سلسلہ میں جو کوششیں کی تھیں اور نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے جو جدو جہد کی تھی اس سلسلہ کی ایک رپورٹ روداد ندوہ میں شائع ہوئی ہے، جسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

دلی کے اجلاس سالانہ ندوہ میں یہ تجویز منظور ہوئی تھی کہ ندوہ کے اہتمام سے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کرایا جائے، اس کے مصارف کے لئے جناب حکیم اجمل خان صاحب کی کوشش سے کرنل اسماعیل خان صاحب سفیر افغانستان نے پانچ ہزار کی رقم دینی منظور کی تھی۔

جلسہ کے بعد میں نے متعدد حضرات سے اس بارہ میں خط کتابت کی۔اسی سلسلہ میں نواب عمادالملک بلگرامی کو بھی خط لکھا انہوں نے جواب لکھا کہ میں نے قرآن مجید کا ترجمہ شروع کر دیا ہے اور دو برس میں پورا کر دوں گا۔

تمام ہندوستان میں نواب صاحب موصوف کے سوا اس وقت کوئی ایسا مسلمان موجود نہیں جو عربی داں بھی ہو اور ایسی اعلیٰ درجہ کی انگریزی لکھ سکتا ہو کہ اہل زبان اس کا اعتراف کریں، اس بنا پر لوگوں نے اس خبر کو بڑی مسرت سے سنا اور میں نواب صاحب موصوف سے برابر اس کے متعلق خط کتابت کرتا رہا،لیکن چونکہ مقصود یہ تھا کہ ترجمہ شخصی حیثیت سے نہ ہو، بلکہ قابل اور زبان داں اشخاص کی ایک کمیٹی قائم کی جائے اور وہ لوگ ترجمہ کو غور اور فکر سے پڑھ کر تنقید کریں اور یہ تنقیدات نواب صاحب کے پاس بھیج دی جایا کریں،اس غرض سے میں نے ایک کمیٹی قائم کی جس میں مولوی حمیدالدین صاحب بی۔اے،مولوی محمد صالح صاحب ایم۔اے بھی شامل تھے۔مولوی حمیدالدین کی عربی زبان دانی کو اہل مصر نے بھی تسلیم کیا ہے اور ان کی تفسیر عربی کے جس قدر اجزا شائع ہو چکے ہیں وہ خود ان کے کمال ادب کے شاہد ہیں۔

نواب صاحب موصوف نہایت انصاف پرست اور متواضع شخص ہیں۔وہ اس کے لئے آمادہ ہیں کہ جو رائیں پیش کی جائیں گی ان پر وہ کافی لحاظ کریں گے۔ چنانچہ جب سورۂ فاتحہ کے ترجمہ کے متعلق مولوی حمیدالدین صاحب کی مفصل تنقیدی یادداشت ان کے پاس پہونچی تو انہوں نے مجھ کو یہ الفاظ لکھے:

> ''مولوی حمیدالدین صاحب کا نوٹ سورۂ الحمد پر ملا، میں ان کے نکات کی جہاں تک ممکن ہوگا پابندی کروں گا۔''

نواب صاحب موصوف نے پہلی اطلاع جو ترجمہ کے ابتداء کی دی تھی وہ ۸ر اپریل ۱۹۱۰ء کی تھی۔اس کے بعد ۲۲رجون ۱۹۱۰ء کو ان کا خط آیا کہ وہ سورۂ بقرا اور آل

عمران پر نظر ثانی کر رہے ہیں۔ ۲۳/اگست ۱۹۱۰ء کو انہوں نے سورہ بقر کا ترجمہ چھپوا کر بھیج دیا اور خط میں لکھا کہ سورۂ نساء کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ ۱۲/اپریل ۱۹۱۱ء کے خط میں انہوں نے اطلاع دی کہ ۵/سورتوں کا ترجمہ چھپ گیا میں اپنے ساتھ ان کو ولایت لے جاؤں گا اور اگر خرچ کا متحمل ہوسکونگا تو وہیں چھپوا دوں گا۔ ۲۵/مارچ ۱۹۱۲ء کے خط میں لکھا کہ سورۂ انعام کا ترجمہ انشاءاللہ تعالیٰ جلد چھپوا کر آپ کو بھیجا جاتا ہے۔

ترجمہ کی خصوصیات

قرآن شریف کے جتنے ترجمے انگریزی میں ہوئے ہیں سب میں کوئی نہ کوئی سخت نقص ہے۔ سب سے بہتر ترجمہ راڈول صاحب کا ہے لیکن وہ بھی نقائص سے خالی نہیں۔ نواب صاحب نے اپنے ترجمے میں جو خصوصیتیں ملحوظ رکھی ہیں، حسب ذیل ہیں، جیسا کہ وہ خود اپنے الفاظ میں لکھتے ہیں:

''(۱) عبارت میں روانی ایسی ہو کہ پڑھنے میں لطف آوے، انسجام ہو۔''

(۲) تفسیر کی بو بھی نہ پائی جائے نہ ترجمہ لفظ بہ لفظ ہو

(۳) رقاقت الفاظ و ''ہمواری اصوات کا لحاظ رہے۔''

انگریزی زبان میں انجیل کا جو ترجمہ کیا گیا، اس کی نسبت عام اتفاق ہے کہ اس سے بہتر انگریزی نہیں لکھی گئی۔ مبصرین کا بیان ہے کہ نواب صاحب کے ترجمۂ قرآن کی انگریزی بھی اسی طرز کی ہے۔

نواب صاحب موصوف جس محنت، کاوش، احتیاط، غور وفکر اور بار بار مراجعت اور نظر ثانی کے ساتھ ترجمہ کر رہے ہیں اس کا اندازہ ان کے بعض فقرات سے ہوگا جو کہ میں ان کے خطوط سے اقتباس کرتا ہوں:

''میں اس وقت سورۂ بقرہ وسورۂ آل عمران کے ترجمے پر نظر ثانی کررہا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ بار بار نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ نظر ثانی نہیں بلکہ نظر عاشر بھی ہو تو بعض مقامات پر اطمینان نہیں ہوتا۔ چند مقام کا جو بظاہر نہایت آسان معلوم ہوتے ہیں بطور مثال ذکر کرتا ہوں۔ سورۂ فاتحہ میں **غیر المغضوب علیھم و لاالضالین** کا ترجمہ دوطرح سے ہوسکتا ہے، علیٰ ہٰذا۔ سورۂ بقرہ کی اول آیت کا ترجمہ دوطرح سے ہوسکتا ہے۔ **ھذا** کو مبتدا اور **الکتاب** کو خبر تو ایک طور سے ترجمہ ہوگا اور اگر **ھذا الکتاب** کو مبتدا خیال کریں تو ترجمہ بدل جائے گا۔''

''اس قسم کے شکوک پیدا ہوتے ہیں، اکثر تو ان میں سے ایسے ہیں جن میں خود مفسرین میں اختلاف ہو۔ ایسی صورتوں میں کس کی ہدایت کی متابعت کی جائے۔''

''حتی الامکان ترجمہ لفظ بلفظ کیا گیا ہے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ چھاپنے کے وقت صفحہ کے بائیں کچھ حواشی لکھنا پڑے گا۔''

''میری محنت اور میری مشکلات کا اندازہ آپ خود کرسکتے ہیں۔ ایک ایک سورہ کے ترجمے اور نظر ثانی و ثالث و رابع میں مہینوں صرف ہوجاتے ہیں۔ تفاسیر ولغات کی طرف رجوع کرنا سب میرے ہی ذمہ ہے۔ اس پر بھی مجھے خود پوری تشفی نہیں ہوتی ہے۔ میں نہ فقیہ ہوں نہ محدث، نہ بڑا زبان داں، اس پر بھی جو کچھ مجھ سے ہوسکتا ہے میں اس میں کوتاہی نہیں کرتا ہوں، بعض مقامات ایسے پیش آتے ہیں کہ ان میں صلاح ومشورہ کی ضرورت ہوتی ہے، مشتے نمونہ از خروارے۔ مثلاً **کانوا یفعلون** کی ترکیب پر جہاں جہاں قرآن شریف میں کلمات

آئے ہیں انہیں معنی استمرار لینا چاہئے یا نہیں۔''

کسب اور اکتسب کا کیا ترجمہ ہونا چاہئے۔

لیسوا ایمانھم میں لیس کے لفظی معنی کا لحاظ رکھنا چاہئے یا نہیں؟ اس قسم کے بہت مقام ہیں کہاں تک لکھوں۔''

اخیر اطلاعی خط جو نواب صاحب کا آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دس پاروں کا ترجمہ ہو چکا، لیکن اسی اثنا میں وہ وزارت حیدرآباد کے مددگار مقرر ہو گئے، جب سے ان کا کوئی خط نہیں آیا، لیکن مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ حضور نظام نے متعدد عربی داں اور انگریزی داں اشخاص، ان کی مدد کے لئے مقرر کر دئے ہیں، اس لئے امید ہے کہ وہ کام کو جاری رکھ سکیں۔

اس سلسلہ میں یہ امر بھی افسوس کے ساتھ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ سفیر صاحب افغانستان نے مصارف ترجمہ کے لئے جو پانچ ہزار دینے منظور کئے تھے۔ اس میں سے صرف پانچ سو وصول ہوئے۔ باقی کے لئے میں نے بار بار تحریک کی لیکن بظاہر کوئی امید نہیں معلوم ہوتی۔

---

[۱۵]

مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کی دو نایاب کتابیں

کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد کے مالک عبداللہ خاں صاحب نے غلام علی آزاد بلگرامی کی دو نایاب کتابیں مآثر الکرام اور سرو آزاد

شائع کیں تو علامہ شبلی سے فرمائش کر کے دونوں تعارف لکھوایا اور
الہلال کلکتہ میں شائع کرایا۔ یہ اشتہاری تحریر الہلال کے متعدد شماروں
میں شائع ہوئی ہے۔

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی ان وسیع النظر محققین میں سے ہیں کہ ان کے ہاتھ کی دوسطریں ہات آجاتی ہیں تو اہل نظر آنکھوں سے لگاتے ہیں کہ ذخیرہ معلومات میں قابل قدر اضافہ ہوگیا۔ اہل ملک کی خوش قسمتی ہے کہ مولوی عبداللہ خاں صاحب [کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد] کی کوششوں سے ان کی تصنیفات سے دونہایت اعلیٰ درجہ کی تصنیفیں آج کل شائع ہوئی ہیں۔ سروآزاد اور مآثر الکرام۔ سروآزاد خاص شعرائے متاخرین کا تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ جامعیت حالات کے ساتھ یہ خصوصیت بھی رکھتا ہے کہ اس میں جو انتخابی اشعار ہیں اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ ورنہ آزاد کے متعلق یہ عام شکایت ہے کہ ان کا مذاق شاعری صحیح نہیں اور خزانہ عامرہ اور ید بیضا میں انہوں نے اساتذہ کا جو کلام انتخاباً نقل کیا ہے، اکثر ادنیٰ درجہ کے اشعار ہیں۔

مآثر الکرام میں ان حضرات صوفیہ کے حالات ہیں جو ابتدائے عہد اسلام سے اخیر زمانہ مصنف تک ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ دونوں کتابوں میں عام حالات کے ذیل میں ایسے مفید اور نادر معلومات ہیں جو ہزاروں اوراق کے الٹنے سے بھی ہات نہیں آسکتیں۔ میں آزاد کی روح سے شرمندہ ہوں کہ علالت اور ضعف کی وجہ سے ان کی نادر تصانیف کے ریویو کا حق ادا نہ کرسکا اور صرف چند اشتہاری جملوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ شائقین فن شوق خریداری کا ثبوت دے کر ان کی روح سے شرمندہ نہ ہوں گے۔ قیمت ہر دو حصہ حسب ذیل ہے:

مآثر الکرام، ۳۳۴ صفحات، قیمت ۲ روپئے، علاوہ محصول ڈاک
سروآزاد، ۴۲۲ صفحات، قیمت ۳ روپئے، علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ: عبداللہ خاں صاحب: کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن

(الہلال، ۲۸؍جنوری ۱۹۱۴ء ص ۷۳)

---

[۱۶]

معارف

یہ علامہ شبلی کے قلم سے نکلا ہوا آخری منصوبہ ہے۔ ۱۹۱۴ء میں جب وہ سیرۃ النبیؐ کی تکمیل، دارالمصنّفین کی تکمیل اور شبلی کالج اور مدرسۃ الاصلاح کو ملا کر ایک وسیع جامعہ اسلامیہ کا خاکہ پیش نظر تھا انہوں نے معارف کا بھی خاکہ پیش کیا اور چند ماہ بعد ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء کو رحلت فرمائی۔

۱۔نام:	معارف
۲۔چیف ایڈیٹر:	شبلی
۳۔اسٹاف:	مولوی سلیمان، مولوی عبدالماجد، مسٹر حفیظ، مولوی عبدالسلام
۴۔تعداد صفحات، تقطیع و کاغذ:	۲۰×۲۹، ضخامت ۴۰؍صفحے، قیمت ۳؍روپے
تنوعات مضامین:	فلسفہ، تاریخ قدیم وجدید، سائنس
ادبیات:	شعر، اردو شاعری کی تاریخ اور اسالیب
اقتباسات:	مجلّات علمیہ یورپ اور مصر و بیروت

فن تعلیم: کتب نادرہ کا ذکر اور ان کے اقتباسات یا ان پر
اظہار رائے

تنقید: کتب یا علوم جدیدہ پر

مصر سے المقتطف، الہلال، المنار اور بیروت سے
المقتبس منگوائے جائیں۔ بہ قیمت یورپ کے علمی
پرچے منگوائے جائیں۔

(قلمی یادداشت محفوظہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ)

کتابیات

کتب

۱۔ آثار شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ۔۲۰۱۳ء

۲۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال، امان اللہ خاں شروانی، علی گڑھ۔۱۹۹۴ء

۳۔ الایمان، سید محمود علی، امرت سر۔ب ت

۴۔ باقیات شبلی، مشتاق حسین، آزاد کتاب گھر دہلی۔۱۹۶۴ء

۵۔ تاریخ ندوۃ العلماء، اول و دوم، مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ

۶۔ تاریخ النوائط، نواب عزیز جنگ ولا، حیدرآباد۔۱۹۰۴ء

۷۔ حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین۔۲۰۱۵ء

۸۔ حیات النذیر، افتخار عالم مارہروی

۹۔ خطبات شبلی، مولانا عبدالسلام ندوی، دارالمصنّفین۔۲۰۰۸ء

۱۰۔ خطوط شبلی، امین زبیری، ساہتیہ اکادمی دہلی۔۲۰۱۷ء

۱۱۔ ذکر شبلی، امین زبیری، لکھنؤ۔۱۹۴۶ء

۱۲۔ روداد ندوۃ العلماء لکھنؤ، علامہ شبلی نعمانی، آسی پریس لکھنؤ۔۱۹۰۷ء

۱۳۔ روداد ندوۃ العلماء اجلاس ہفتم، لکھنؤ۔دسمبر ۱۹۰۱ء

۱۴۔ سید احمد خاں کا سفر نامۂ پنجاب، سید اقبال علی، علی گڑھ۔۱۸۸۴ء

۱۵۔ شبلی اور جہان شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ۔۲۰۱۵ء

۱۶۔ شبلی کی علمی وادبی خدمات، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔۲۰۱۲ء

۱۷۔ علامہ شبلی نعمانی صدی کے آئینے میں، مہہ جبیں زیدی، قرطاس۔۲۰۱۴ء

۱۸۔ کتابیات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دار المصنّفین۔۲۰۱۱ء

۱۹۔ مکاتیب شبلی اول، مولانا سید سلیمان ندوی، دار المصنّفین۔۲۰۱۰ء

۲۰۔ مکاتیب شبلی دوم، مولانا سید سلیمان ندوی، دار المصنّفین۔۲۰۱۲ء

۲۱۔ مراسلات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دار المصنّفین۔۲۰۱۶ء

۲۲۔ مکتوبات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ۔۲۰۱۲ء

رسالوں کے خاص شمارے

۲۳۔ صحیفہ لاہور، شبلی نمبر۔۲۰۱۴ء

۲۴۔ کریسنٹ لاہور، شبلی نمبر۔جنوری ۱۹۷۱ء

۲۵۔ معارف اعظم گڑھ، شبلی نمبر، مدیر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی۔نومبر دسمبر ۲۰۱۴ء

رسالوں کے عام شمارے

۲۶۔ الہلال کلکتہ (مدیر مولانا ابوالکلام آزاد) ۲۸/جنوری ۱۹۱۴ء

۲۷۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور، جلد ۵۶ شمارہ نمبر ا، مسلسل نمبر ۲۲۴

۲۸۔ ادبی دنیا لاہور۔ستمبر اکتوبر ۱۹۶۶ء

۲۹۔ ادیب علی گڑھ۔جولائی اگست ۱۹۶۳ء

۳۰۔ العلم کراچی۔جنوری ۱۹۵۲ء

۳۱۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ: ۱۳/مارچ ۱۸۸۶ء، ۲۴/جولائی ۱۸۸۸ء

۳۲۔ زمیندار لاہور۔۲۷/اپریل ۱۹۱۴ء

۳۳۔ صحیفہ لاہور: اکتوبر ۱۹۷۰ء، جنوری ۱۹۷۱ء

۳۴۔ علی گڑھ کالج میگزین، ۴۸-۱۹۴۹ء

۳۵۔ فکر ونظر، علی گڑھ: ستمبر ۱۹۸۵ء، ستمبر ۱۹۸۶ء

۳۶۔ کانفرنس گزٹ، علی گڑھ۔ اکتوبر ۲۰۱۱ء

۳۷۔ لسان الصدق کلکتہ، مولانا ابوالکلام آزاد۔ اگست ستمبر ۱۹۰۴ء

۳۸۔ ماہ نو کراچی۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء

۳۹۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین، مدیر علامہ شبلی۔ مئی ۱۸۹۶ء

۴۰۔ معارف اعظم گڑھ: اکتوبر ۱۹۲۵ء، جنوری ۱۹۶۸ء، اکتوبر ۱۹۶۹ء، اپریل ۲۰۱۵ء، مئی ۲۰۱۵ء

۴۱۔ نیرنگ خیال۔ نومبر ۱۹۲۴ء

۴۲۔ وکیل امرت سر: ۱۷/اکتوبر ۱۹۰۲ء، ۲۷/اکتوبر ۱۹۰۲ء

مرتب کی دیگر مطبوعات

شبلی شناسی

۱۔ متعلقات شبلی
۲۔ کتابیات شبلی
۳۔ شبلی سخنوروں کی نظر میں
۴۔ مکتوبات شبلی
۵۔ آثار شبلی
۶۔ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط
۷۔ شبلی شناسی کے سو سال
۸۔ شذرات شبلی
۹۔ اقبال اور دبستان شبلی
۱۰۔ شبلی اور جہان شبلی
۱۱۔ مراسلات شبلی
۱۲۔ نوادرات شبلی

تحقیق و تنقید

۱۳۔ اسہل التجوید
۱۴۔ تذکرۃ القراء
۱۵۔ علم الترتیل
۱۶۔ علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ
۱۷۔ دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات
۱۸۔ اشاریہ ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ
۱۹۔ عظمت کے نشاں
۲۰۔ ساحلوں کے شہر میں
۲۱۔ شاہ معین الدین احمد ندوی
۲۲۔ مطالعات و مشاہدات
۲۳۔ کتابیں حصہ اول
۲۴۔ کتابیں حصہ دوم
۲۵۔ یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی
۲۶۔ عکس و اثر
۲۷۔ کتابیات مجیب
۲۸۔ قرائے عظام اور ان کی علمی و دینی خدمات
۲۹۔ محبت نامے

ترجمہ

۳۰۔ رحمت عالم (اردو سے ہندی)

تحقیق و تدوین

۳۱۔ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر
۳۲۔ موازنہ انیس و دبیر
۳۳۔ کاروان رفتگاں
۳۴۔ تاریخ اعظم گڑھ
۳۵۔ اسفار مجیب
۳۶۔ کلیات نشور واحدی حصہ غزلیات

NAWADERAT-E-SHIBLI

By

DR. MOHAMMAD ILYAS AZMI

حالیہ دہائی کے دوران ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے قلم نے مطالعہ شبلی کے باب میں نہ صرف اعتبار حاصل کیا بلکہ علمی حلقوں نے ان کے کاموں کو سراہا بھی ہے۔ انہوں نے مطالعہ شبلی کے نئے نئے گوشے وا کیے ہیں۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ شبلیات کے مطالعہ میں ان کی کتابوں سے صرف نظر ممکن نہیں۔ ''متعلقات شبلی'' سے ''نوادرات شبلی'' تک ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اپنی جس تنقیدی و تحقیقی بصیرت کا ثبوت دیا ہے وہ قابل قدر بھی ہے اور قابل رشک بھی۔

شبلی جیسی جامع الکمال شخصیت کا مکمل احاطہ چند ایک کتابوں میں تو ممکن ہی نہیں ہے اور ایسی صورت میں جبکہ ان کی بہت سی چیزیں ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں۔ اس کا خاطر خواہ اندازہ مکتوبات شبلی اور شبلی کے نام اہل علم کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے۔ (ان چیزوں کو جمع کرنے میں ایک صدی بیت گئی) معارف کے حالیہ شمارہ میں اسلامی یونی ورسٹی کے قیام سے متعلق شبلی کی تجویز سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ایسی صورت میں ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے کام کی وقعت یوں بھی دو چند ہو جاتی ہے کہ ان کے پیش نظر پورے شبلی کی بازیافت ہے۔ خوش آیند بات یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی مطالعات شبلی کے حوالے سے انتہائی اہمیت کے حامل کام کر رہے ہیں۔

پروفیسر اختر الواسع

ADABI DAIRA, AZAMGARH

email : azami408@gmail.com
Website : www.drmiazmi.webs.com
Mob.: 9838573645

ISBN 819340321-1
9788193403211

₹ 400/-